نئی شاعری

مُرتبہ

واجد احمد فاروقی ایم۔ اے، ال۔ ٹی (الہ آباد)

پبلشر

گیا پرشاد اینڈ سنز۔ آگرہ

قیمت عہ/

نئی شاعری

میں جدید اردو شاعری کے میلانات و رجحانات سے بحث کی گئی ہے
اور شعراء کے حالات مع نمونۂ کلام کے درج کئے گئے ہیں

مرتبہ

خواجہ احمد فاروقی ایم۔ اے، ال۔ ٹی (الہ آباد)

پبلشر

گیا پرشاد اینڈ سنز۔ آگرہ

قیمت عہ

پہلا ایڈیشن ۱۹۴۰ء

دوسرا ایڈیشن بعد تصحیح و اضافہ ۱۹۴۳ء

تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۸ء

چوتھا ایڈیشن ۱۹۴۸ء

باہتمام خواجہ فراست حسین صاحب منیجر

آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ میں چھپی

نئی شاعری

فہرست

ترتیب بہ اعتبار سنین ولادت

غزلیات

منظومات جدید

نئی شاعری

خواجہ احمد فاروقی ایم۔ اے

عارف کے نام

گشتہ جدا ز دیدہ و داماں چگونہ؟

(نظیری)

مقدمہ

اُردو دُنیا کی تمام زبانوں میں نوعمر ہے، اس کی ترقّی جن مساعد اور نامساعد حالات میں ہوئی اُن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس نے سوا سو برس کے اندر کس طرح قابلِ قدر ادبی اور شعری سرمایہ جمع کرلیا۔ اُردو شاعری نے جب آنکھ کھولی تو مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ معاشرہ پر ایک انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا۔ زندگی "سکر دوام" میں تبدیل ہو چکی تھی اور ہر شخص یک گونہ بیخودی کے عالم میں مست و خراب تھا۔ دِلّی کی عظمت دن بدن گھٹ رہی تھی اور صوبوں میں نوابیاں اور خودمختاریاں قائم ہو گئی تھیں۔ اس ماحول میں اُردو شاعری پلی بھی اور بڑھی بھی۔ انحطاط پذیر بھی ہوئی اور ترقی بھی حاصل کی۔ اس لئے کہ یہ زمانہ ایک طریقہ سے ہمارے زوال کا بھی تھا اور عروج کا بھی۔ فنونِ لطیفہ کے حصول کے لئے جس جوش و خروش کا اظہار اس زمانہ میں ہوا اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ شعر و سخن کا ذوق معاشرت کا جزو بن گیا تھا لیکن چونکہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے یہ زمانہ قومی افراتفری اور پستی کا تھا اس وجہ سے ان اجتماعی میلانات نے اُردو شاعری کے معیار، ارتقا، تسلسل اور وجدانیات پر ایک گہرا اور خاص اثر ڈالا۔

جب مرکزِ ثقل دکن سے دہلی کو منتقل ہوا تو اُردو شاعری کا بقول شخصے یہ حال

ہوگیا جیسے ایک بچہ جوان ہونے سے پہلے بوڑھا ہو جائے۔ وہ لوگ جنھوں نے اُردو شاعری پر اپنا نام ثبت کرکے اس کا ایک معیار قائم کیا۔ وہ صرف فارسی شاعری ہی کے دلدادہ نہیں تھے بلکہ اُن کی ذہنیت، رُجحانات اور خیالات سب فارسی ہی نے تعمیر کیے تھے۔ پہلے پہلے انھوں نے ریختہ کو تبدیلِ ذائقہ کے طور پر لکھا لیکن رفتہ رفتہ تجربہ کامیاب ہو کر محبوب مشغلہ بن گیا اور پھر فارسی کے حسنِ استعار سے اُردو شاعری کے بڑے بڑے جوہر دکھلائے گئے۔

تقریباً ۱۷۴۳ء سے اُردو شاعری کا بہترین دور شروع ہوتا ہے۔ اُس وقت وہ ترتیب و تشکیل کے ابتدائی مدارج سے گذر چکی تھی۔ اُس کا قالب بن چکا تھا اور زبان وعروض کی خامیاں کم سے کمتر رہ گئی تھیں۔ اُس وقت سودا، میر اور دردؔ، قائم اور سوزؔ نے جدتِ ادا، لطافتِ تخیل اور وسعتِ نظر کے کمالات دکھلائے۔ میر کی افتادگی اور دردؔ کی والہانہ ربودگی نے تغزل میں معیاری شان پیدا کردی۔ چنانچہ داخلی اور قلبی واردات کی غم انگیز عکاسی میں میر کا ہمسر کوئی پیدا نہ ہوسکا۔ اس طرح دردؔ نے عرفان نفس اور کائنات کے روحانی پہلوؤں کو جس طرح بے نقاب کیا ہے وہ بھی انھیں پر ختم ہوگیا۔ سوداؔ نے بھی شگفتگی، طرفگی، مضامین اور جزئیات نگاری سے شاعری کا ایوانِ رفیع تیار کیا۔

متوسطین کے دورِ دوم میں جو تقریباً ۱۷۵۸ء سے لیکر ۱۸۰۵ء تک جاری رہا اُردو شاعری دربار سے وابستہ ہوگئی، اور حصولِ زر و امیر رسی کا ذریعہ بن گئی۔ دورِ ماقبل کے شعراء بھی اپنے سرپرستوں سے انعام و اکرام کے طالب ہوتے تھے لیکن اپنی خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے اور درباری وابستگی کا لازمی نتیجہ

یہ ہوا کہ شعر کی روحانیت، بلند پروازی، وسعت، تنوع اور پُرکاری ختم ہو گئی۔ اُس وقت سوسائٹی پر بھی جوش وہوسناکی، اخلاقی فرومایگی، تصنع اور بناوٹ کا رنگ چڑھا ہوا تھا، وہی عکس معاشرتی آئینہ یعنی شاعری میں بھی آگیا۔ اُس زمانہ کی اُردو شاعری کا مقابلہ انگریزی شاعری کے عہد "عود شاہی" سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں سنگ ریزوں کے ساتھ جواہر ریزے بھی ملتے ہیں۔ جرأت کے یہاں جب خارجیت نکھر جاتی ہے اور اس میں داخلیت کا میل ہو جاتا ہے تو معاملہ بندی کا اعجاز نظر آنے لگتا ہے یا مصحفی کے یہاں مختلف رنگوں میں امتزاج پیدا ہو جاتا ہے تو بہت ہی دلکش معلوم ہوتا ہے۔ انشا اور رنگین کی حیاسوز اور عریاں جذبات نگاری کی تلافی میر حسن نے مثنوی سحرالبیان لکھ کر کر دی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حسن و محبت کے راگ کو جس میٹھی بول چال اور فصیح زبان میں چھیڑا ہے وہ بات کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔

شعرائے متوسطین کے تیسرے دور (۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۰ء) میں لطف و اثر اور بھی کم ہو گیا اور تغزل صرف تصنع ظاہری آرائش اور سجاوٹ کا نام رہ گیا۔ یہیں سے دہلی اور لکھنؤ اسکول کے راستے الگ ہو گئے۔ ناسخ اور اُن کے متبعین نے جہاں تک کہنے کا تعلق ہے بہت سی باتیں کہیں لیکن یورپ کی شاعری کی طرح اس کا تعلق روح اور وجدان کی گہرائیوں سے نہیں ہے۔ آتش کے یہاں یہ بات بہت کم ہے۔ اُن کی غزل میں تمثیلی انداز ہے، مرصع سازی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جذبات کی دلکشی ہے۔ نظیر عہدِ حاضر کے پیش رو ہیں۔ اسلئے کہ اُن کا تمثیلی طرز، مقامی رنگ، منظر کشی اور مصوّری یکجا طور پر مشکل سے ملتی ہے۔

(متاخرین کا دورِ اوّل (۱۸۲۵-۱۸۷۵ء) اُردو غزل گوئی کا عہدِ زریں اُس وقت غزل میں نکھار پیدا ہو رہا تھا، خارجیت اور داخلیت سموئی جا رہی تھ صنائعِ لفظی کم ہو رہے تھے اور فارسی کی ترکیبیں حسنِ معنی کو بڑھا رہی تھیں۔ دہل میں مومن کا رشک آمیز سوز، اور غالب کے شوخ و ذہین عشق نے پیکرِ الفاظ میں رو پھونک دی تھی۔ اسی وسعتِ تخیّل اور لطافتِ بیان نے جدید اُردو شاعر کے لئے راہ ہموار کی۔ بقول ڈاکٹر عبدالحق "اگر غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبا بھی نہ ہوتے"۔ لیکن لکھنؤ کا ماحولِ بدمستی اور ہنگامہ نا و نوش صرف صبا اور ور ہی کی تخلیق کر سکتا تھا۔ انسان شاید دو ہی اجزا سے مرکب ہے۔ ایک زندگی کا ارا دوسرا بندگی کا جذبہ۔ زوال و انحطاط کے زمانہ میں زندگی کا ارادہ "گرمیِ محفل" میں صرف ہوتا ہے اور بندگی کا جذبہ معاشرتی اور ذہنی اصنام کی پرستش میں ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں شاعری نے جامۂ عریانی اختیار کر لیا۔ بے پڑہ مفا تصنّع، نسوانیت، مبتذل الفاظ، سوقیانہ محاورے اور انگیا چوٹی کا ذکر شعر و سخن جان ہو گیا۔ یوں سمجھئے کہ انشا اور اُن کے ساتھیوں نے جو کام شروع کیا تھا وہ مکم ہو گیا اور "اختر پیا" کی فضا نے اس رنگ کو ایسا اُچھالا کہ بقول شخصے ہولی کا سو اور گنواروں کی کبیرات ہو گئی۔ لیکن وقت کی یہ عام مایوسیاں مستثنیات سے خالی نہیں تھیں۔ قدرت نے انیس و دبیر کو پیدا کر دیا جن کے شعری کارنامے اُردو کے باعثِ فخر ہیں۔

متاخرین کے دورِ دوم میں لکھنؤ کی شاعری پر ناسخی رنگ چڑھا ہوا تھا نے اسے خوشنما بنا دیا لیکن جذبات کی نازک تحلیل یہاں بھی زیادہ نہ ہو سکی۔

نے البتہ لکھنوی لباس میں دہلی کے حُسنِ معنی کو پیش کیا اور اس طرح غزلِ جدید کے لئے راہ کھول دی۔ دہلی میں داغ نے بالکل نیا تغزّل شروع کیا جو نہ صحیح معنوں میں لکھنوی ہی ہے اور نہ دہلوی۔ اس میں دہلی کا سوز و گداز نہیں لیکن جذبات ہیں۔ لکھنؤ کا سا تصنّع نہیں ابتذال ہے۔ شوخی و شیرینی سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ حالی نے جو پچھلی باتوں سے بھی باخبر تھے اور نئی تبدیلیوں سے بھی آشنا، جدید اُردو غزل کا سنگِ بنیاد رکھا۔

اس وقت مغلیہ حکومت کا علم سرنگوں ہو چکا تھا اور تمام ملک میں انگریزی تسلّط کی بنیادیں استوار ہو چکی تھیں۔ سیاسی نظام کے بدلنے سے تمام اجتماعی اور معاشرتی نظام متزلزل ہو چکا تھا۔ اس وقت زندگی کی دوبارہ تنظیم، نظریات میں ضروری تبدیلی اور نئی باتوں سے تطابق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ جن میں یہ نیا زاویۂ نگاہ پیدا کرنے کی ہمت نہیں تھی یا جو پُرانی دُنیا کو چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھے وہ ریاستوں میں چلے گئے۔ مثلاً امیر و داغ لیکن حالی زمانہ شناس اور دُور اندیش تھے۔ انھوں نے رسمیات سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی۔ مشاہدہ اور غور و فکر سے کام لیا اور پیشِ نظر حالات اور واقعات کو اپنا موضوعِ شاعری بنایا۔ معاشرہ کی عظمتِ دیرینہ ان کی آنکھوں کے سامنے مٹ رہی تھی۔ انھوں نے قوم اس کا احساس دلایا اور بعض بعض غزلیں تک اسی تلقینی رنگ میں لکھیں۔

یہ زمانہ سائنس و عقلیات کی ترقی اور مغربی فکر و خیال کی روشناسی کا بھی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جذبات و معاملاتِ حسن و عشق میں اعتدال برتا جانے لگا اور ادنیٰ خیالات اور بازاری معاملات ممنوع الاظہار قرار دئے گئے۔

تصوف کا عنصر بہت کم ہوگیا تھا۔ مطالعۂ فطرت اور رفعتِ فکر پر زور دیا جانے لگا اور حیات اور وجدانیات کی ایک نئی دُنیا تعمیر کی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ حالیؔ کی غزلوں میں واقعیت اور عقلیت کا عنصر نمایاں ہے۔ اُن کا لہجہ متوازن اور انداز سلجھا ہوا ہے) اُن کی غزلوں میں جدید معنویت اور نئی ذہنیت کارفرما ہے قدیم کلام میں بھی شیفتہ جیسے اصلیت پسند شاعر کا رنگ جھلکتا ہے۔

اکبرؔ کے ادوارِ شاعری سے حالات کے سلسلہ میں بحث کی جا چکی ہے۔ اُن کی غزلوں کا بھی لہجہ بعد میں بالکل بدل گیا۔ ان کے تغزل میں فلسفیانہ رنگ، وسعتِ عمق پاکیزگیٔ خیال، سچائی اور اعتدال پایا جاتا ہے اور بعض بعض جگہ بیباکی، اصلاحی اور ظریفانہ انداز بھی نمایاں ہو گیا ہے۔

(اقبالؔ کی غزلوں میں "روحانیت" اور واقعیت کی آمیزش ہے جلومِ جدید سیاسیات، حیات اور کائنات کے عالمگیر مسائل، مشرق و مغرب کی آویزش نئی ذہنیت اور نئے وجدان کے ایسے نقوش بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی غزلوں میں ملتے ہیں کہ اُن سے اُردو شاعری میں بالکل ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ انھوں نے غزل کو قومیاتِ شعری میں داخل کرکے اس سے نظم کا کام لیا ہے اور اسی لئے اس میں تسلسلِ خیال پایا جاتا ہے۔ لیکن ان کوششوں نے بعض بعض اشعار کی شعریت کو سخت صدمہ پہونچایا ہے۔)

شادؔ کے یہاں لکھنویت ہے لیکن ایسی جذبات نگاری بھی ہے جو میرؔ کی یاد دلاتی ہے۔ ناسخؔ کے سے صنائع و بدائع ہیں لیکن اعتدال سے زیادہ نہیں ہیں۔ اُن کے یہاں اخلاق و فلسفہ کا بھی عنصر ہے۔ تغزل میں سادگی و متانت ہے!

سادہ ترکیبیں اور دلکش الفاظ ہیں۔ لکھنویت اور دہلویت کا سادہ امتزاج ہے جس نے کلام میں ایک نئی انفرادیت پیدا کر دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جب اہلِ شوق کہتے ہیں افسانہ آپ کا   ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا

یہ سب درست کہ تم بُت بھی ہو خدا بھی ہو   مگر نیاز کے قابل یہ دل رہا بھی ہو۔

میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

ریاضؔ کی میخوارانہ شاعری دُنیائے اُردو میں بڑی لطف انگیز اور مسرت خیز چیز ہے۔ فارسی کی تقلید میں رندی و شراب نوشی کا تذکرہ قدما نے بھی کیا ہے لیکن ریاضؔ کے یہاں رنگینی و شوخی، مسرت زائی و شیرینی زیادہ ہے۔ اُن کی زندگی بڑی پریشانیوں میں گذری لیکن وہ طبعاً نشاط پسند تھے۔ چنانچہ اپنی شاعری اور حسن کاری سے عیش و خرمی کی ایک دُنیا بنائی۔ اُسی میں زندہ رہے اور اُسی میں مرے۔ وہ حقیقتاً ابیقورین فلسفہ کے مظہر اور اُس عہد کی یادگار تھے جب اودھ کی زندگی کا مفہوم باوجود تباہی اور بربادی کے صرف مسرت و نشاط کا حصول تھا۔ ان کے کلام میں بعض بعض جگہ ابتذال اور واسوخت کا بھی رنگ پیدا ہو گیا ہے ذیل کے اشعار سے ان کا رنگِ تغزل واضح ہو گا ؎

نشہ سے جھکی پڑتی بھی ہیں ہی تری آنکھیں   چھیڑوں سے مری اور بڑھا بوجھ حیا کا

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور　　نکلے جو میکدہ سے تو دُنیا بدل گئی

کچھ شوخیٔ رفتار میں بھی کم ہے قیامت　　کچھ قد بھی نکلتا ہے بُتِ شوخ ادا کا

ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی　　وہ سر پہ لئے حوضِ کوثر نہ نکلے

صفیؔ کی غزلوں میں کہیں کہیں خطیبانہ رنگ، نظم کی شان اور لکھنویت آگئی ہے لیکن پھر بھی اُن کے یہاں ایسے سادہ، لطیف اور نورآگیں اشعار کی کمی نہیں ہے ؎

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا　　ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

دل سے نزدیک ہیں آنکھوں سے بہت دُور نہیں　　مگر اس پر بھی ملاقات انھیں منظور نہیں

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے　　آشیاں اُجڑا کیا، ہم ناتواں دیکھا کئے

ثاقبؔ لکھنوی میرؔ و غالبؔ کے کلام سے متاثر ہیں اور لکھنؤ اسکول کے امتزاج اور اختلاط کا حقیقی آئینہ ہیں۔ زبان پر قدرت رکھتے ہیں۔ مضمون آفرینی اور نکتہ وری اُن کی خصوصیات ہیں۔ اس دور کے شاعروں میں یاسؔ یگانہ کو بھی مہارتِ شعری حاصل ہے۔ اُن کے یہاں تعبیر بلند، گہرائی اور پختگی موجود ہے اور اسی کے ساتھ ایک نئی لگاوٹ، ایک نئی کسک اور ایک نیا نکھار ملتا ہے مثلاً ؎

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا　　بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

نشۂ عشق کو اس طرح اُترتے دیکھا　　عیب پر اپنے جیسے کوئی پشیماں ہو جائے

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے　　وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

بشش جہت میں ہے ترے جلوۂ بےفیض کی دُھوم
کان سُنتے ہیں مگر آنکھ گنہگار نہیں

آرزو نے غزل گو شاید ایک سماجی فعل سمجھ کر اس کو زیادہ عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے۔ بعض غزلیں انھوں نے بے عطف و اضافت اور بغیر عربی فارسی الفاظ کے کہی ہیں۔ ان میں شیرینی، نرمی اور نغمگی ہے لیکن بعض بعض جگہ اسی کوشش نے دقت پیدا کر دی ہے اور علوئے خیال کو کم کر دیا ہے۔

(حسرت کے یہاں جدید رنگ آمیزی کے ساتھ میر کی سی مصوّری ہے۔ اُن کے یہاں زبان بھی ہے اور جذبات بھی ہیں لیکن وہ جذبات جو شاعری کی جان ہیں اور جن کے متعلق ارسطو کہتا ہے کہ جس میں سوز و اُلفت جو احساسات کی روح ہیں موجود نہیں، وہ انسان لازمہ انسانیت سے خارج ہے۔ اُن کے یہاں سوز و گدازِ محبت، والہانہ تاثر اور حسن و عشق کی نفسیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق فرماتے ہیں کہ "یہ میرا یقین ہے کہ حسرت کی شاعری ہی ان کی بقائے دوام کا باعث ہوگی"۔ حسرت نے زندگی کے حقائق کو اس کے ہنگاموں میں شریک ہو کر سمجھا ہے لیکن ایک اعلیٰ فن کار کی طرح اُن کے یہاں

خارجیت اور داخلیت کا بہت ہی مناسب امتزاج ہے اور تلقینی انداز نمایاں نہیں ہے۔ جوہر کے تغزل میں آپ بیتی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ سیاسی اور مذہبی رجحانات اور اسیری و نظر بندی کی زندگی نے اُن کے کلام کو خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ ذیل کی غزل اُن کے طرز خاص کی آئینہ دار ہے ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں ۔۔۔ اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں
ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفّی ہے ۔۔۔ ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں ۔۔۔ ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت ۔۔۔ اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بُلا بھیجیں ۔۔۔ بھیجی ہیں دُرودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں
بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منا یا کر ۔۔۔ ٹلتیں نہیں یوں جوہر اس دیس کی برساتیں

— فانی بدایونی یاسیات کے امام ہیں اور ایک مستقل رنگ کے مالک ہیں۔ اپنے طرز میں بڑی بڑی حقیقتوں کو جذبات کی مصوری، تخئیل کی بلندی اور واردات کی نزاکتوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور یہی اُن کے تاج کمال کا طرہ ہے۔ کیٹس کی طرح درد، عشق اور خلشِ غم اُن کا سرمایۂ حیات ہے لیکن فانی حزن و افسردگی ہی کے تخلیق فلسفہ میں مدطولیٰ نہیں رکھتے بلکہ اُن کے کلام میں کیف و سرمستی، جوشِ بیان، رنگینی، اخلاقیات اور معاملہ بندی کے بھی اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا ۔۔۔ اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا
میری ہوس کو عیشِ دو عالم بھی تھا قبول ۔۔۔ تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا

چشمِ ساقی کی وہ مخمور نگاہی ، توبہ　　آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے　　تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں　　مجھے یہ غم کہ غمِ جاوداں نہیں ملتا

عزیزؔ نے بھی اُردو غزل کو بلند معیار پر لانے کی بڑی کوشش کی ہے۔ پہلے تو غزل صرف خلوت و جلوت کی حدود میں گھری ہوئی تھی، اب ساری کائنات اس کی آغوش میں ہے۔ عزیزؔ کا کلام اس کا آئینہ دار ہے۔ اُن کی حیثیت غزل کے ارتقا میں میل راہ کی سی ہے۔ جہاں بیک وقت قدیم و جدید تغزّل کے خط و خال نظر آتے ہیں۔ شیرینی و نرمی، اشاراتی انداز اور نفسیاتی توازن ان کی غزلوں میں پوری طرح موجود ہے۔ عزیزؔ، غالبؔ اسکول سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بعض بعض جگہ مشکل پسندی کی وجہ سے اشعار ثقیل اور دور از فہم ہو گئے ہیں۔ بعض بعض جگہ تقلید بھی بہت گوارا نہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود مضمون کی جستجو، الفاظ کی تلاش، تراکیب کی چستی اور خیال کی حلاوت میں انھیں بڑی دسترس حاصل ہے۔ عزیزؔ نے نظمیں اور قصیدے بھی لکھے ہیں جو بہت کامیاب ہیں۔ اصغرؔ کی طبیعت پر صوفیانہ رنگ چڑھا ہوا تھا اور غالبؔ اور اقبالؔ کے طرز سے متاثر تھے۔ اسی لئے اُن کے یہاں مسرّت زائی، بلند خیالی اور معنویت ہے لیکن بعض بعض جگہ متصوفانہ فلسفہ طرازی نے شعریت کو دبا دیا ہے۔

اُن کے مخصوص رنگ کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؂

تری ہزار برتری تری ہزار مصلحت　　مری ہر اک شکست میں مرے ہر اک قصور میں

اُفتادگانِ عشق نے سراب تو رکھ دیا　　اُٹھیں گے بھی تو نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسّم ہائے پنہاں کی　　شعاعیں کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو　　مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

سُنتا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی　　کچھ خواب ہے، کچھ اصل، کچھ اندازِ بیاں ہے

جگرؔ کے یہاں حافظؔ کی سی رنگینی اور خیامؔ کی سی رندی و سرشاری ہے. یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام تفاؤل و مسرّت کا عنصر زیادہ ہے۔ اُن کے تغزّل میں سرخوشی و سرمستی، روانی و شگفتگی، لطیف مصوّری اور حسن وعشق کی نفسیات پوری طرح موجود ہیں. لیکن ہمیں اس تلخ حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس ہیجانیت کی زیادتی اور روک تھام کی کمی کے باعث اپنے طولانی جذبات کو وزنی اور اعلیٰ معنویت سے متوازن نہیں بنا سکے جو شعر میں بلندی، گہرائی اور وسعت پیدا کرنے کے لئے از بس ضروری ہے۔ ذیل کے اشعار اُنکے لطیف تغزّل کا نمونہ ہیں ؎

ہنسی پھر اُٹھنے لگی عشق کے فسانے کی　　نقاب اُٹھاؤ بدل دو فضا زمانے کی

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حُسن　　جب دیکھئے اک نیند سی آنکھوں میں بھری ہے

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ   سن رہا ہوں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

ہائے وہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو   میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

— فراق کا تغزل دورِ حاضر کے میلانات کا مظہر ہے۔ ان کے کلام کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ حیات و کائنات کے نئے شعور و احساس اور انفرادیت اور آفاقیت کی ہم آہنگی کو غزل میں نمایاں جگہ دینا چاہتے ہیں۔

ان شعراء کے علاوہ چند غزل گو شاعروں کے نام یہ ہیں۔ ان میں سے بعض کے یہاں نیا رنگ ہے، بعض کے یہاں پرانا اور بعض کے یہاں دونوں رنگوں کا اختلاط ہے :- وحشت، جلیل، دل، احسن، آزاد، قمر، نوح، سائل، کیفی، حفیظ جونپوری، آشفتہ، اثر لکھنوی، رضا، محشر، قدیر، آتش، صفدر، ماہر، مانی، جگر بریلوی، ہادی، آسی، حامد، سیماب، فیض، وصل، افسر، نازش۔

(دورِ حاضر کی غزل گوئی ماضی سے صرف لب و لہجہ، انداز اور وسعت کے اعتبار سے بدلی ہوئی ہے۔ لیکن اس جدت پسندی اور نئی سمت کی تعمیری کوشش میں درد و تاثر اور شعریت بھی گھٹ گئی ہے۔ انقلاب اور لفظ تراشی کے جوش میں اصولِ شعر و غزل سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ زبان و محاورہ کی لغزشیں اور فنی غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں لیکن یہ دورِ تداخل ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہ گذرنے والی موجِ غزل کی زمین کو جو جامعیت اور مرکزیت کی وجہ سے سرفراز ہے، اور بھی زرخیز کر جائے)

نظم :- اردو میں ۱۸۷۴ء سے قبل علیحدہ عنوانات پر مستقل نظمیں لکھنے

عام رواج نہیں تھا قصیدوں کی تشبیب اور مثنویوں اور مرثیوں کے بعض حصوں میں ضمنی طور پر بیانیہ تمثیلی اور تشریحی شاعری کے نمونے مل جاتے ہیں لیکن شعرائے متقدمین نے انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت پر نظر ڈالی سلطان قلی قطب شاہ والئ گولکنڈہ (متوفی ۱۶۱۱ء) کا دیوان اس کا شاہد ہے۔ اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک یہ سلسلہ منقطع رہا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں سودا اور میر نے واقعات و حوادث، مناظرِ قدرت، مظاہرِ فطرت کی عکاسی اور مصوری میں بہت کچھ زورِ قلم صرف کیا۔ اس کے بعد نظیر اکبرآبادی (۱۷۴۰-۱۸۳۰) نے اُردو شاعری کے درخشاں مستقبل کا اعلان کیا اور نئی راہیں کھول دیں۔ اُن کا کلام مستقبل کی شاعری کا سنگِ بنیاد ہے اور اس میں وہ تمام خط و خال موجود ہیں جو منظوماتِ جدید کی حسن و خوبی کا باعث ہوئے۔

یہ قلیل سرمایہ بہت عمدہ ہے لیکن اس کی شان بالکل شفق کی اُن رنگینیوں کی سی ہے جو آئینہ خانہ میں مقید کی جا رہی ہوں۔ شمع جب بھڑک کر خاموش ہو جائے تو بغیر مشعل کے کیونکر روشن ہو سکتی ہے۔ نظم کو یہ محرکات غدر کے بعد نصیب ہوئے۔ جب ملکی سلطنت کا تختہ اُلٹ گیا اور سیاسی نظام میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہو گئیں تو انگریزوں کے تسلط قائم ہو جانے سے نئے خیالات، نئی ضرورتیں اور نئے حالات پیدا ہوئے۔ اب شاعروں کو نہ وہ شاہانہ سرپرستی حاصل تھی اور نہ زمانۂ قدیم ذہنیت اور پرانی دُنیا کا مساعد تھا۔ اس لئے ذاتی مشاہدہ پر زور دیا گیا۔ مغربی فکر و خیال سے واقفیت نے اس چیز کو اور فروغ دیا۔ اُردو عدالتی زبان بن گئی اور انگریزوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی۔ لاہور میں آزاد کی کوشش سے

اور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کی سرپرستی میں ایک بزمِ مشاعرہ قائم ہوئی (۱۸۷۴ء) جس میں غزلوں کے بجائے نیچرل اور اخلاقی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ حالی بھی پنجاب پہونچ گئے تھے۔ انھوں نے اس مشاعرے کے لئے برکھارت، امید، انصاف اور حب وطن مثنویاں لکھیں جو اپنے حسنِ بیان، فطریت اور سادگی کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ حالی کا قومیاتِ شعری میں بھی بلند درجہ ہے۔ ان کا مسدس اپنی نصب العینیت، مربوط خیالی اور درد و تاثر کے اعتبار سے اُردو میں ایک مہتم بالشان شعری کارنامہ ہے۔ حالی کی شاعری میں صداقت، عقلیت اور حقیقت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس میں عرب کے شاعروں کا سا قرانہ پن ہے۔ مسدس لکھتے وقت جو درد اُن کے دل میں پیدا ہوا ہے وہ آخر وقت تک اُن کے کلام میں باقی رہا۔ اس کام کے محرک سرسید علیہ الرحمۃ تھے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں "بے شک میں اس کام کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اُن اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا۔ میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ بھی نہیں۔" بعض بعض جگہ حالی کی شاعری میں سنجیدگی نے واعظانہ اور ناصحانہ رنگ پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اس وقت کی نئی ضرورتوں اور پیہم تبدیلیوں میں اس قسم کی لغزشیں ناگزیر تھیں۔

حالی نے زبان و بیان کے بھی بڑے کارنامے دکھلائے ہیں۔ ایک جگہ دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :-

ریت کی سی دیوار ہے دُنیا　　اوچھے کا سا پیار ہے دُنیا
بجلی کی سی چمک ہے اُس کی　　پل دو پل چمک ہے اُس کی

پانی کا سا دا ہے یہ بچارا　جگنو کا سا ہے چمکا را
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یہاں کا　ناؤ کا سنجوگ ہے یہاں کا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے　اس نگری کی ریت یہی ہے

حالی نے جدید اُردو شاعری کا سنگِ بنیاد ہی نہیں رکھا بلکہ مستقبل کے شعراء پر بھی بڑا اثر ڈالا۔ حالی کے ساتھ ساتھ آزاد نے بھی اپنی نظموں میں جدت طرازی کے نمونے دکھلائے۔

نئی شاعری کا یہ پہلا دور زیادہ تر شکست و ریخت اور نئی تعمیری کوششوں سے وابستہ ہے۔ اس وجہ سے اس میں حسن کاری کا عنصر زیادہ نہیں ہے لیکن اسمیں ایک نیا شعور، ایک نئی ذہنیت اور ایک نئی کسک ہے جو بے حد دلفریب معلوم ہوتی ہے۔ اسمٰعیل کے یہاں شعریت اور نفسیات کا اثر زیادہ دلپذیر ہے۔ اُن کی نظموں میں بلا کی سادگی و روانی، حسنِ فطرت کی جھلک اور مقامی رنگ ہے جو دل کی گہرائیوں کو متاثر کرتا ہے۔ اسمٰعیل کے یہاں موضوعات کا تنوع، بحور و قوافی کی سخت و جابر رسوم سے آزادی، جزئیات نگاری اور شاعرانہ صنعت گری حالی اور آزاد سے زیادہ ہے۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے لکھا ہے کہ اکبر کی شاعری کی نمود و ترقی کا زمانہ اُنیسویں صدی عیسوی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا خمسِ اوّل ہے۔ یہی زمانہ ہندوستان میں مغربیت کے انتہائے عروج کا ہے۔ ملک و قوم کی یہ حالت ہے کہ غدر کو فرو ہوئے چند سال گزر چکے ہیں۔ ہندوستان بیرونی مداخلت و تسلط کے شکنجہ میں پورے طور پر کسا ہوا ہے۔ اسلامی اخلاق، اسلامی آداب اسلامی شعا

مدت ہوئی رخصت ہو چکے ہیں.... عقائد میں تزلزل آچکا ہے۔ ایمان کی مضبوطی ایک افسانۂ پارینہ رہ گئی ہے۔ نفس پروری اور عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ داد خواہی کے لئے انگریزی شفاخانے ہیں۔ رسل و رسائل کے لئے انگریزی ڈاک خانے ہیں، مہاجنی کے لئے انگریزی کوٹھیاں اور بینک ہیں۔ ماضی سے واقفیت کے لئے انگریزوں کی کتابیں ہیں۔ حال سے باخبر رہنے کے لئے انگریزوں کے اخبارات ہیں مستقبل کی پیشین گوئی کے لئے انگریزی سائنس ہے.... غرض جس طرف بھی رُخ پھرتا، حدِ نظر تک ایک غیر محدود، نامتناہی پرچم انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا.... سوتے ہوئے شخص کے کمرہ میں دفعتاً تیز روشنی کر دی جائے تو وہ سمجھے گا کہ آفتاب نکل آیا۔ یہی حال اس وقت قوم کا تھا۔ اضطرارِ قلب، اختلالِ حواس و اجتماع، حوادث کے وقت دیو میں پری کا حسن و جمال معلوم ہوا اور عجوزہ ہفتاد سالہ پر نازنین شانزدہ سالہ کا دھوکا ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے علوم و فنون، شعائر و رسوم اور عقائد و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دیکر انگریزیت کے صنم دلربا پر نثار کر دیا۔

اکبرؔ کی شاعری اس زمانہ کا آئینہ ہے

اس وقت نوحہ خوانی کا دور ایک حد تک ختم ہو چکا تھا اور قلوب پر صبر و اطمینان نے تسلط جما لیا تھا۔ زخم مرورِ ایام سے مندمل ہو چلے تھے لیکن داغ باقی تھے۔ اس صورت میں "آہ" "طنز" ہی کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔ چنانچہ اکبرؔ نے ہنسا ہنسا کر اشکبار کیا اور رُلا رُلا کر ہنسایا۔ اس وقت نئی اور پرانی تہذیب کی آویزش جاری تھی اور ہر شعبۂ زندگی میں نہایت سرعت کے ساتھ تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ ان

باتوں کا نتیجہ ایک کشمکش اور ردِ عمل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اکبر کے یہاں یہ باتیں پوری طرح جلوہ گر ہیں اور اس وقت کی حالت کی صنعت گرانہ طور پر مصوری کی گئی ہے۔ انھوں نے معاشرہ پر خرابیاں دیکھیں، کورانہ تقلید کی برائیوں، ماضی اور مستقبل کی طرف بیگانگی اور مذہب وملت کی کس مپرسی کو محسوس کیا اور اس کے خلاف آواز اُٹھائی لیکن یہ نکتہ چینی ظرافت کے پیرایہ میں کی جو موثر بھی ہے اور "بدمستی" کے عالم میں سننے والوں کو ناگوار بھی نہیں ہوتی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں سے

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

سرافرازی ہوا دنٹوں کی تو گردن کاٹئے اُنکی
اگر بندر کی بن آئے تو فیضِ ارتقا کہئے

سینے ادھر ایسے کہ سہیں جور ر فسل بھی
کان ان کے وہ نازک کہ گراں مری غزل بھی

تھے معزز شخص لیکن اُن کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درج گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

شوق قدوائی نے اپنے دل کی دُنیا الگ بنائی۔ اسی لئے اُن کے یہاں

داخلیت زیادہ ہے۔ اُن کے کلام میں مقامی رنگ، خیالات میں تنوع اور طرفگی مضامین، فطرت اور جذبات کی عکاسی غرض وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں جو شاعرانہ صنعت گری کے لئے ضروری ہیں۔ ان کے یہاں عظمت اللہ خاں کا سا نسوانی جذبات کا اظہار اور اسمٰعیل کی سی تصویر کشی ہے۔ بے نظیر شاہ کی نظموں میں مصوّری، منظرکشی داخلی اور خارجی رنگ کا میل جول، سادگی اور حسنِ ادا ہے جس نے ان کے کلام میں حد درجہ دلکشی اور دلفریبی پیدا کردی ہے۔ صفی نے شہروں کے تاریخی اور دلکش مناظر مذاقِ سلیم کی حدود میں رہ کر اور نامانوس انگریزیت سے بچ کر خوب نظم کئے ہیں۔ سرور کی نظموں کے عناصر شعریت، اصلیت اور داخلی محاکات ہیں لیکن کثرت نگاری نے ان کے کلام میں سقم اور ضعف بھی پیدا کر دیا ہے۔

اقبال نے جس وقت میدانِ شاعری میں قدم رکھا اُس وقت ایشیا کا سیاسی، مادّی اور اخلاقی تنزل انتہا کو پہونچ چکا تھا۔ یہاں اگر کچھ رہ گیا تھا تو صرف اوہام کا تار و پود۔ قوائے عمل شل ہو چکے تھے اور شعلۂ حیات سرد ہو رہا تھا اس مرقع میں مسلمانوں کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ تھی۔ اقبال نے جس کو مشرق و مغرب دونوں کے علم و حکمت سے واقفیت تھی اس مرض کو سمجھنے کی کوشش کی اور محسوس کیا کہ عملی اور روحانی انحطاط سب سے زیادہ افسوسناک ہے۔ اُس نے مشرق کی درماندہ اقوام میں پھر جان ڈالنا چاہی اور عالمِ اسلامی کی عروقِ مردہ میں "خودی" کے ذریعہ خونِ زندگی دوڑانا چاہا۔ اقبال نے "عملِ پیہم" اور "کوششِ ناتمام" کا درس دیا۔ قومی روایات اور عظمتِ دیرینہ کی یاد دلائی۔ موجودہ زبوں حالی اور ننگوں ساری کے تذکرہ سے غیرت کی آنکھ کھولنا چاہی اور مستقبل کی اُمید افزا

تصویر کھینچ کر "صبحِ عید" کی خبر دی۔ یہ لے تمام موجودہ ایشیائی ادب میں ملے گی؛ اقبالؔ نے موجودہ بے اطمینانی کے اسباب، سرمایہ و محنت کی کشمکش، مغربی استعمار اور قومیت کی آویزش، موت و حیات کی حقیقت، تہذیب حاضر، وطنیت اور عالمگیر اخوت پر بھی غور کیا اور اُس نے ان سب مسائل کو قرآن کی کسوٹی پر جانچ کر حیات افروز اور خودی پرور ترانوں میں اپنا فیصلہ صادر کیا۔

علامہ اقبالؔ کے نظامِ فکر کے چند اہم مسائل یہ ہیں[۱]:۔

(۱) فرد کی اہمیت اور خودی کی تربیت۔

(۲) نظامِ عالم میں انسان کا مقامِ بلند اور اس کے استعمال کے وسیع و لامحدود امکانات۔

(۳) مادّی ترقی کی کوششوں میں تزکیۂ روحانی کی ضرورت جس کے بغیر مادّی ترقی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔

(۴) اقوامِ یورپ کو یہ پیغامِ عبرت کہ اگر وہ روحانیت سے بیزار ہو کر "این جہانی" تصورِ حیات پر مصر رہیں گے تو ان کی تہذیب تباہ ہو کر رہے گی۔

(۵) اقوامِ مشرق علی الخصوص مسلم اقوامِ مشرق میں روحانی فضیلت اور برتری کا ازسرِ نو احساس پیدا کرنا۔

اقبالؔ نے ان حکیمانہ اور فلسفیانہ مسائل کو اس سلیقہ کے ساتھ آبِ رنگِ شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے کہ دل و نظر ان میں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں اور

---

[۱] ماڈرن انڈیا اینڈ دی ویسٹ۔

ض وقت سخن آرائی خود طرزِ ادا کی ندرت و طرفگی پر وجد کرنے لگتی ہے۔ اقبال کے لوئے شعری کا اعتراف ہر چہار طرف ہوا ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو ایک خط میں ھتی ہیں:-

"اقبال کی شاعری نے میری روح کو وطنیت کی سلاسل سے آزاد کرکے اس میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور مجھ میں تمام بنی نوعِ انسان سے محبت کرنے کی جسارت اور قابلیت پیدا کردی ہے۔"

ظفر علی خاں کی نظموں سے مہارتِ شعری، قدرتِ بیان اور جوشِ اثر کا پتہ چلتا ہے لیکن ان کی بعض بعض نظمیں بالکل ہنگامی اور وقتی اہمیت رکھتی ہیں۔

سیماب بہت زود گو ہیں۔ "کارِ امروز" کے دو ہزار اشعار انھوں نے رف ۲۰ دن میں کہے۔ اتنی زود گوئی اور کثرت نگاری کی صورت میں گہرائی کی می اور لفظی و معنوی غلطیاں مل سکتی ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ان کے یہاں دبی و شعری محاسن بہت زیادہ ہیں۔ طرفگیٔ مضامین اور جدتِ اسلوب نے ن کے کلام میں جاذبیت پیدا کر دی ہے۔

چکبست کی شاعری میں آتش، انیس اور حالی کا رنگ نظر آتا ہے۔ اُن کی ظموں میں مفکرانہ پختگی فطرت نگاری اور قومی و وطنی احساس پوری طرح جلوہ گر ہے۔ محروم کا کلام جذبات و تاثرات سے مملو ہے۔ زبان کی صفائی، الفاظ کی برجستگی زجموں کی روانی، خیالات کی پاکیزگی قابلِ داد ہے۔ اس کے علاوہ صلح و آشتی کے جذبہ نے ان کی نظموں میں ایک خاص کشش پیدا کر دی ہے۔

دُنیائے شاعری میں گیتوں کو سرستی اور سوز و گداز کے اعتبار سے بڑا درجہ حاصل ہے۔ اُردو میں عظمت اللہ خاں، حفیظ جالندھری، تاثیر، مقبول احمد پوری، ساغر نظامی، حفیظ ہوشیارپوری اور اندرجیت وغیرہ نے اس صنف کو ترقی دے کر اُردو شاعری میں ایک نیا رس پیدا کر دیا ہے۔ عظمت اللہ خاں اس قسم کی شاعری کے پیش رو ہیں۔ اُن کے کلام میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو بھاشا میں عام ہیں۔ اُن کا مجموعہ "سُریلے بول" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ شوق قدوائی، آرزو اور رضا لکھنوی نے بھی مختلف طریقوں سے اس طرح کی جذبات نگاری کی سعی کی ہے لیکن عظمت ایک نئے دبستاں کے بانی ہیں۔ اُن کے مترنم الفاظ اور مترنم بحروں نے درد و اثر کو بڑھا دیا ہے۔ "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" میں ایک مایوس محبت لڑکی اپنے "محبوب" کی دوسری جگہ شادی ہو جانے پر کہتی ہے ؎

مرے تا یہ بڑے تھے زمانہ شناس　　بڑے اُونچے گھرانے میں ٹھیرا بیام
گیا ٹوٹ سا جی، گئی ٹوٹ سی آس　　مری چاہ کا ہو گیا کام تمام

بڑی دھوم ہے آئی تمہاری دُلہن　　میں بھی کام میں بیاہ کے ایسی جتی
کوئی اور تھی گو مری پیاری دُلہن"　　کہا سب نے بڑی ہے بہن کو خوشی

جوش ملیح آبادی عصرِ حاضر کی انقلابی شاعری کے علمبردار ہیں۔ اُن کے کلام میں نئے رُجحانات و میلانات، حسین شعریت اور والہانہ تاثر کے ساتھ پیوست ہو گئے ہیں۔ موجودہ سیاسی اور معاشرتی حالات نے اس امتزاج میں بڑی مدد دی ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء اور سنہ ۱۹۳۹ء کی لڑائیاں، سنہ ۱۹۲۱ء کی تحریک

عدم تعاون، ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کا معاشی اضطراب، ۱۹۳۱ء کی سیاسی تحریک، اشتراکیت کی نئی رو، تعلیمی نظام کی ناکامی، بے روزگاری کا سیلاب، جمہوریت کا شعور، افلاس وبے اطمینانی، سرمایہ ومحنت کی کشمکش غرض ان تمام باتوں نے ہماری شاعری کا رخ بدل دیا ہے۔ اب شاعروں کے دل" زلفِ پیچاں" سے نکلکر زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں کو محسوس کر رہے ہیں۔ وہ تاریخ کے اشاروں کو سمجھنا چاہتے ہیں اور اسی لئے وہ شاعری کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے میں مصروف ہیں، یہ ادبی تحریک دُنیا میں انقلابی ادب پیدا کرنے کی وسیع تر کوشش کا ایک جزو معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ نغمہ آج چین، رُوس، انگلستان اور امریکہ سب ملکوں میں گونج رہا ہے۔

جوشؔ جب زندگی کی تلخیوں سے گریز اور کنارہ کشی کرتے ہیں تو حسن ومحبت کی خیالی دُنیا میں پہونچ جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے کلام میں زندگی کی جھلک اور ایک انقلابی ذہنیت نظر آتی ہے جس نے تمام نوجوان شاعروں کو متاثر کیا ہے۔ اخترؔ کے یہاں بھی جوشؔ کا سا "گریز" پایا جاتا ہے لیکن انکی "شب پرستانہ" شاعری درسِ حیات اور ملک کی محبت سے خالی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو عروض کی پُرانی اور رسمی پابندیوں کا محتاج نہیں بنایا ہے بلکہ نئی اور مترنم بحروں کو رواج دیا ہے۔ الفاظ اور خیال میں دلکشی اور خارجی مناظر کی عکاسی میں فطریت اور لطافت پیدا کی ہے جو ہمیں ورڈسورتھ کی یاد دلاتی ہے۔ مقامی رنگ بھی اُن کے یہاں بہت نکھرا ہوا ہے۔

حفیظؔ جالندھری اقبالؔ کے نظریہ سے متاثر ہیں اور اسلامی عظمت

کو پھر زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا کلام بڑی جدتوں کا حامل ہے۔ خصوصاً اس سے کہ انھوں نے عظمت اللہ خاں کی طرح چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں کو رائج ہے اور سنگلاخ کو بجور و قوافی اور اوزان سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ حفیظ کے یہاں مقامی رنگ بھی ایک نئے اسلوب سے موجود ہے۔ اُن کا "شاہنامہ اسلام" غلطیوں سے پاک نہ سہی لیکن اُردو میں تاریخی اعتبار سے پہلا کارنامہ ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری لطیف رومانیت کی حامل ہے۔ اُن کے یہاں زندگی کی تلخیوں سے "گریز و فرار" کی خواہش سب سے زیادہ ہے جیسا کہ اُن کی نظم "اے عشق کہیں لے چل" سے ظاہر ہے۔ روش صدیقی کی نظموں میں تصویرکشی، لفظی خوش آہنگی اور واضح اور پاکیزہ معنویت ہے۔ احسان کے یہاں نزاکتِ خیال بھی ہے اور حسنِ خیال بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی پُرآشوب زندگی نے انھیں مشاہدہ اور مطالعہ فطرت کے بہت مواقع فراہم کئے ہیں۔ انکی فطرت نگاری میں عبرت و بصیرت کا بھی ایک کھلا ہوا پہلو ہوتا ہے۔ "مزدوروں کی موت" اسکی روشن مثال ہے۔ ان کے یہاں کچھ نقائص ایسے بھی ہیں جو کثرت نگاری نے پیدا کئے ہیں۔

مجاز اشتر کی شاعر ہیں لیکن اُن کی شاعری سراسر داخلی یا عملی نہیں ہے کہ اس کے اوپر آورد کا شبہ ہونے لگے۔ اُن کے کلام میں ترنم و موسیقی ہے۔ تعمیری شعریت ہے اور ایک ایسا اسلوب ہے جو نفسِ مضمون سے ہم آہنگ ہے۔ چاند کو دیکھ کر ایک آوارہ و مفلس کے تاثرات ملاحظہ ہوں:۔

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

جاں نثار اختر مضطر خیرآبادی کے صاحبزادے ہیں۔ شاعری کا ذوق انھیں وراثت میں ملا ہے۔ لیکن بقول جوش کے "انھیں جو وراثت ملی تھی وہ قدامت گزیدہ تھی جس کے منہ پہ جھرّیاں تھیں اور جس کے دانت گرے ہوئے تھے" ان کی جوان طبیعت نے اس رنگ سے بغاوت کی اور شاعری کا ایسا اسلوب اور انداز اختیار کیا جس کے امکانات وسیع ہیں اور جس کا مستقبل شاندار معلوم ہوتا ہے۔ ایک نظم "ابھی نہیں" کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔

بہار ہے تو کیا، حرام ہے نشاطِ گلستاں   ابھی تو خود ہی سینۂ چمن میں آگ ہے نہاں
یہ جشنِ گل ابھی نہیں! یہ رنگ و بو ابھی نہیں؟

ابھی تو چرخِ زندگی پہ ظلمتوں کا دور ہے   ابھی تو بجلیوں کی زد پہ خرمنِ وجود ہے
نظارہ سوز مہوشوں کی آرزو ابھی نہیں؟

ابھی تو غیر معتبر ہے شرحِ کائنات کی   ابھی تو بحث گرم ہے مسائلِ حیات کی
نیاز و ناز کی لطیف گفتگو ابھی نہیں؟

ابھی تو دورِ نو ہے غرقِ شورِ ناوک و کمند   ابھی تو جامِ عرض سے ہے ایک موجِ خوں بلند
مے کہن ابھی نہیں، خم و سبو ابھی نہیں؟

ساغر کے یہاں ہرچند کہ مفکرانہ شان نمایاں نہیں ہے لیکن حیاتِ نو کی ترجمانی، خیال کی شادابی، بھاشا کی شیرینی اور موسیقیت کی دلکشی پائی جاتی ہے۔

ان کی جدید غزلیں اور رومانی اور وطنی نظمیں ادب کی نئی کروٹیں ہیں جن ؍
مستقبل کافی درخشاں اور تابناک ہے۔ اُن کا ایک مجموعہ ہندی رسم الخط
بھی چھپ چکا ہے۔ اس نوع کی شاعری کے نمونے جس میں زندگی کی حرارت
آزادی کے شعلے ہوں اور انقلاب کی پکار ہو شہاب، فیض، جعفری، وقار
جذبی اور مخدوم وغیرہ کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ اس شاعری کا سماج سے چولی دا
کا ساتھ ہے۔ اس میں ذاتی غم اور مسرتیں، وسیع تر حقائق کا جزو معلوم ہوتی ہیں
لیکن یہ راہ جتنی آسان ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے۔ محض ایک نظم کو "مزدور مارکر
کر دینے سے اس میں شاعرانہ اور فنّی خوبیاں نہیں پیدا ہو سکتیں اور نہ وہ آر
کا نمونہ اور شعری کارنامہ کہلائی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے خارج
اور داخلیت کے بیحد لطیف و حسین امتزاج کی، حسن ترتیب کی لب و لہجہ
نرمی و شگفتگی، تعبیر شاعرانہ اور کنایہ کی، خیال کے تدریجی علو کی اور نظم کے اشار
اختتام کی۔ محض چند لفظوں سے کھیلنا اور انقلاب انقلاب کی رٹ لگانا کوئی
نہیں رکھتا۔ ان شعراء کے علاوہ چند نظم لکھنے والوں کے نام یہ ہیں:۔ علی اختر
اقبال، سہیل، عدم، عابد، الطاف، ساغر، طالب، نظر، انند نرائن ملا، راز
ظفر، میراجی، قاسمی، علی منظور، سرور، احتشام، سلام۔ اُردو میں اب بلند پا
نظموں کی کمی نہیں ہے۔ اس کا دامن گلہائے رنگا رنگ سے بھر چلا ہے۔ مضامین
تنوع، وسعت، جدّت، معنویت اور نیا شعور و احساس یہ سب باتیں کا فی
نظر فریب ہیں اور نظم کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی ہیں لیکن اس
کے ساتھ ساتھ ہمیں خامیوں سے بھی چشم پوشی نہیں کرنا چاہیئے۔ ابھی نظم جدید

حُسن کاری اور آرٹ کی بلند منزلیں طے کرنا ہیں۔ ہمیں زبان کی روح میں داخل ہونا ہے اور مختلف کلچروں اور خیالات کو اپنے دماغ کا جزو لاینفک بنانا ہے۔ یہ کام محض جدت طرازی اور مشکل پسندی سے نہیں ہوسکتا۔ کچھ لوگ ہیں کہ وہ بزرگوں کے کارنامے بہت پُرجوش آواز میں گا رہے ہیں لیکن ہمیں نیند آتی ہے، کچھ ہیں کہ آزادی کے راگ الاپ رہے ہیں لیکن ہمیں ہنسی آتی ہے۔ اس کی وجہ اشتہار بازی اور صحافت کی ارزانی ہے۔ اس خام پیداوار میں لغت کی غلطیاں، اصولِ شعر سے بیگانگی، عروض قافیہ کے اسقام، عریانی، جذباتی پستی، یا اس کی بے پناہ فراوانی، واعظانہ بلند آہنگی الفاظ کی زیادتی، معانی کی کمی، معاشرتی رجحانات اور تحریکات سے لاپروائی، غرض یہ تمام خرابیاں ملتی ہیں لیکن وہ ایسی مایوس کن نہیں ہیں کہ کوشش سے دُور نہ ہوسکیں۔ اسکے علاوہ بہت سی بُرائیاں تو اس وجہ سے ہیں کہ ہمارا معاشرتی نظام کشمکش اور انتشار کے عالم میں ہے اور ہماری شاعری بھی ایک درمیانی زمانہ کو عبور کر رہی ہے۔

اُردو شاعری میں رُباعی بھی شروع ہی سے پائی جاتی ہے۔ دکن میں بھی اس صنف کی طرف سے غفلت نہیں برتی گئی۔ شعراء دہلی و لکھنؤ نے غزلیات و قصائد کے ساتھ رُباعیاں بھی کہیں۔ لیکن غدر تک ان کی طرف توجہ محض ضمنی طور پر تھی۔ انیس و دبیر اور شعرائے مرثیہ نے بھی رباعی کو بڑا فروغ بخشا اور اس میں مضامین و خیالات کا قابلِ قدر اضافہ کیا۔ اس کے بعد حالی و اکبر نے اس سے تلقینی اور اصلاحی کام لیا۔ عصرِ حاضر میں اس صنف کے اندر جتنی طبع آزمائی کی گئی ہے اس کی نظیر رُباعی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ دور کثرتِ تعداد، وسعتِ مضامین اور جدتِ بیان کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ امجد اس زمانہ کے مشہور رُباعی گو ہیں۔ اُن کی رباعیاں "زندگی

کے اعلیٰ ترین رُخ کو پیش کرتی ہیں اور بلحاظ ادب اظہارِ خیال کا بہترین نمونہ ہیں۔
یاسؔ و یگانہ بھی رُباعی کہنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اس رباعی سے انکی انفرادیت اور مذاق کی پختگی پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔

کعبہ کی طرف دور سے سجدہ کرلوں ۔۔۔ یا دیر کا آخری نظارہ کرلوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دُنیا ۔۔۔ اک اور گنہ کرلوں کہ توبہ کرلوں

دورِ حاضر کے ایک کامیاب لیکن پردۂ خفا میں مستور رُباعی گو پروفیسر حامد حسن قادری ہیں۔ ان کی رباعیوں کا رنگ یہ ہے ؎

اس عہدِ شباب پر جو مغرور ہے تو ۔۔۔ یہ سوچ کہ حق سے کس قدر دور ہے تو
بہتر ہے کہ خوشی سے کرلے سجدہ بھی کبھی ۔۔۔ پیری میں تو رکوع پر مجبور ہے تو
اُٹھ صبح ہوئی خبر ہے غافل تجھکو ۔۔۔ فیضانِ سحر نہیں ہے حاصل تجھکو
مشکیں کس لی ہیں کروٹوں نے تیری ۔۔۔ شکنیں بستر کی ہیں سلاسل تجھکو

جوشؔ ملیح آبادی نے بھی اس صنف میں جوہر دکھلائے ہیں۔ محویت و مستی ان کی رباعیوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ رواںؔ کی رباعیوں میں بھی فنی اشارے اور واردات و محسوسات کی ترجمانی ملتی ہے۔

اُردو شاعری کی تزئین اور آرائش میں جن شعراء نے حصّہ لیا ہے اُن کی فہرست طویل ہے۔ ہر دور میں بہت سے ناموں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے میرے تذکرے کو مکمّل نہ سمجھا جائے۔

خاکسار
خواجہ احمد فاروقی

غزلیات

حالیؔ پانی پتی

حالات شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالیؔ پانی پتی ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ غریب باپ کا سایہ ۹ برس کی عمر میں سر سے اُٹھ گیا۔ ۱۸۵۴ء میں تحصیلِ علم کے شوق میں دہلی چلے آئے اور مولوی نوازش علی سے تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ غدر کے زمانہ میں پانی پت رہ کر حدیث، تفسیر، منطق و فلسفہ پڑھا۔ کچھ عرصہ کے بعد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی مصاحبت کا شرف حاصل ہو گیا۔ نواب صاحب کی صحبت نے شعر و شاعری کے ذوق کو اُبھارا اور اپنی غزلیں مرزا غالبؔ کے پاس اصلاح کے لئے بھیجنے لگے۔ آٹھ برس کے بعد حالی لاہور کے گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازم ہو گئے۔ یہاں ان کی جدید شاعری کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور انگریزی خیالات اور طرزِ ادا سے خاص مناسبت پیدا کر لی۔ کچھ عرصہ کے بعد حالیؔ دہلی میں عربک اسکول میں مدرس ہو گئے۔ یہاں سر سیدؒ سے ملاقات ہو گئی۔ یہ ملاقات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے اس کے بعد سے حالیؔ نے قومی اور اخلاقی نظمیں لکھنا شروع کیں۔ مد و جزر اسلام اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

حالی کی منظوم تصانیف یہ ہیں:۔ (۱) مثنویاں :۔ رحم و انصاف وغیرہ، (۲) مدوجزر اسلام (۳) شکوۂ ہند (۴) کلیاتِ حالی (۵) مناجات بیوہ، (۶) مراثی غالب وغیرہ (۷) مجموعۂ نظم حالی۔

کہنے کی بات ہو تو اسے کہہ سنائیے — جو دل پہ بن رہی ہو وہ کیونکر دکھائیے
دُنیا کی ہو ہوس تو دل و دیں گنوائیے — یاں کھوئیے بہت سا تو کچھ جا کے پائیے
یہ کیا کہ دل ہے دیر میں اور کعبے میں مقام — ہو رہیے بس وہیں کے جہاں دل لگائیے
گر جان کا ضرر ہے محبت میں ناصحو — ہم جان ہی سے بیٹھے ہیں بیزار جائیے
اور اعتبار رکھوتے ہوا اپنا رہا سہا — بس آگیا یقیں ہمیں قسمیں نہ کھائیے
ہوتی ہجومِ غم میں ہے کیونکر بسر کی تلاش — حالی بتائیں آپ کو گر کچھ کھلائیے

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق — رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہی بات ہی کچھ اور — عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر — تھا اُن کو ہم سے ربط مگر اسقدر کہاں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں — جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
کوئی دل سوز ہو تو کیجیے بیاں — سرسری دل کی واردات نہیں

متفرق اشعار

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید (۱) خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا
بیقراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ (۲) اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں
یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا (۳) ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
چارہ گر کار بانداز ۂ تدبیر نہیں (۴) کچھ بہت اگر وقتِ دعا یاد رہے

ترک دنیا کے علائق تو کئے سب زاہد (۵) گر مناسب ہو تو اک ترک ریا اور سہی
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم (۶) ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
ہے کچھ اک باقی خلش امید کی (۷) یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہئے
تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب (۸) بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

اکبر الہ آبادی

حالات خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی نے (۱۸۴۶-۱۹۲۱ء) فارسی اور عربی کے ساتھ انگریزی علوم سے بھی واقفیت بہم پہونچائی۔ ترقی کرتے کرتے ۱۸۹۴ء میں جج عدالت خفیفہ کے عہدہ پر پہونچے اور ۱۹۰۳ء میں پنشن لی۔ وحید الہ آبادی تلمیذ آتش لکھنوی کے شاگرد تھے۔

اکبر کی شاعری کے پانچ دور ہیں۔ پہلا دور مشق کا ہے اور زیادہ تر قدیم رنگ کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے دور میں تصنع کے بجائے اصلیت اور واقعیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ تیسرے دور میں جدت اور ظرافت کی فراوانی ہے۔ غزلوں میں اخلاق اور تصوف کا رنگ آگیا ہے۔ چوتھا دور صحیح معنوں میں "لسان العصر" کی شاعری کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس میں غزلیں کم ہیں۔ واقعات حاضرہ پر تنقید کی گئی ہے اور ظرافت نے بڑھ کر طنز کی صورت اختیار کر لی ہے۔ پانچویں دور کی خصوصیات حقائق آگاہی، پختگی، جدت طرازی، نکتہ چینی اور ایک شوخ سنجیدگی ہے جس کو داغ کی زبان میں ہنسا ہنسا کر اشکبار کرنا کہا جا سکتا ہے۔

بہار آئی کھلے گل زیبِ صحنِ بوستاں ہو کر
عنادل نے مچائی دھوم سرگرمِ فغاں ہو کر

بچھا فرشِ زمرد اہتمامِ سبزۂ تر میں
چلی مستانہ وش بادِ صبا عنبر فشاں ہو کر

عروجِ نشۂ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں
ترانے گائے مرغانِ چمن نے شادماں ہو کر

بلائیں شاخِ گل کی لیں نسیمِ صبح گاہی نے
ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگینِ بتاں ہو کر

جوانانِ چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا
کسی نے یاسمن ہو کر کسی نے ارغواں ہو کر

کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحنِ گلستاں میں
صدائے نغمۂ بلبل اٹھی بانگِ اذاں ہو کر

ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کی سجدے کو
ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہو کر

زبانِ برگِ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں
خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر

نگاہیں کاملوں کی پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

شاد عظیم آبادی

حالات خان بہادر سیّد محمد علی شاہ (۱۸۴۶-۱۹۲۷ء) ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن میں عظیم آباد چلے گئے جو دلّی کے ویران ہو جانے کے بعد لکھنؤ کی طرح ایک ادبی مرکز بن گیا تھا۔ شاد کو آغازِ شباب سے شاعری کا شوق تھا جس کی تکمیل سید شاہ اُلفت حسین فریاد شاگرد خواجہ میر دردؔ سے کی۔ عمر کا بیشتر حصہ شعر و سخن کی خدمت میں گذرا۔ قصیدے، قطعے، غزلیں، مثنویاں اور رُباعیاں لکھیں لیکن سب سے زیادہ شہرت غزل اور مرثیہ میں حاصل کی۔ ان کا مجموعہ "کلامِ شاد" چھپ چکا ہے۔

ستم ہے آدمی کے واسطے مجبور ہو جانا　　زمیں کا سخت ہو جانا فلک کا دور ہو جانا
مرے زخموں نے دل کے دل لگی اچھی نکالی ہے　　چھپائے سے تو چھپ جانا مگر ناسور ہو جانا
خیالِ وصل کو اب آرزو جھوٹے بھلاتی ہے　　قریب آنا دلِ مایوس کے پھر دُور ہو جانا
نہ دے الزام بدمستی کا اک افتاد تھی ساقی　　مرا گرنا بھرے ساغر کا چھلکنا چور ہو جانا

ڈھونڈیں گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ، کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
اے شوق پتہ کچھ تو ہی بتا۔ اب تک یہ کرشمہ کچھ نہ کھُلا
ہم میں ہے دلِ بیتاب نہاں یا آپ دلِ بیتاب ہیں ہم
مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے
آجاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

تمناؤں میں اُلجھایا گیا ہوں　　کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
نہیں اُٹھتے قدم کیوں جانبِ دیر　　کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں
دلِ مضطر سے پوچھ اے رونقِ بزم　　میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں
ستایا آکے پہروں آرزو نے　　جو دم بھر آپ میں پایا گیا ہوں
نہ تھا میں معتقد اعجازِ مے کا　　بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

ریاض خیرآبادی

حالات منشی ریاض احمد ریاض (۱۸۵۳-۱۹۳۴ء) نے اپنے وطن خیرآباد کے مدرسۂ عربیہ میں تعلیم حاصل کی۔ اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ لیکن اُن کے انتقال کے بعد امیر مینائی سے اصلاح لینے لگے۔ "گلکدۂ ریاض" کے نام سے ایک پرچہ جاری کیا جس سے اُن کی شہرت دور تک پھیل گئی چنانچہ نواب کلب علی خاں والی رام پور نے اپنے یہاں بلایا لیکن وہ جلد ہی وہاں سے چلے آئے اور مختلف اوقات میں "فتنہ" "عطر فتنہ" "ریاض الاخبار" اور "اعجاز" نکالتے رہے لیکن ان رسالوں کو زیادہ عمریں نصیب نہیں ہوئیں۔ ریاض کا آخری زمانہ بڑی پریشانی اور بے اطمینانی میں گذرا لیکن انھوں نے اپنی حالت کو حتی المقدور کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اُن کا مجموعہ "ریاضِ رضواں" شائع ہو چکا ہے۔

کبھی پے توبہ ہم نے پی ہی نہیں — توبہ یوں کی کہ جیسے کی ہی نہیں
آگ ایسی کہیں لگی ہی نہیں، — کہ لگی دل کی پھر بجھی ہی نہیں
کیوں سنے شیخ قلقلِ مینا — اس نے ایسی کبھی سُنی ہی نہیں
ہائے سبزہ میں وہ سیاہ بوتل — کبھی ایسی گھٹا اُٹھی ہی نہیں
کون لیتا بلائیں پیکاں کی — آرزو دل میں کوئی تھی ہی نہیں
کوئی ناخوش ریاض سے کیوں ہو — اس روش کا وہ آدمی ہی نہیں

متفرق اشعار

صدقے ادائے ناز کے قاتل نے بعد ذبح (۱) دیکھا جو مڑ کے جان سی بسمل میں آگئی
گلا بیٹھا ہوا، خدمت اذاں کی او کعبہ میں (۲) بھلے سے ہم دبا لائے تھے ناقوس برہمن کو
چھلکا ئیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی (۳) تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی
عالم ہُو میں کچھ آواز سی آجاتی ہے (۴) چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا
یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش (۵) سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

ثاقب لکھنوی

حالات مرزا ذاکر حسین نام، ثاقب تخلص، وطنِ مالوف طبرستان، مولد اکبرآباد، گہوارۂ تعلیم و تربیت لکھنؤ۔ ۲ر جنوری ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی میں مہارت حاصل کی۔ انگریزی سینٹ جانس کالج آگرہ میں پڑھی۔ یہیں پر موہن حسین صفی امروہوی شاگرد ذکی مراد آبادی سے شرفِ تقرب حاصل ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب کے نہ صرف شاعرانہ جذبات اُبھر آئے بلکہ کلام پر باعتبارِ فن جلا ہوگئی۔

مرزا ثاقب نے تجارت کا سلسلہ شروع کیا لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ کچھ عرصہ راجہ محمد احمد علی خاں والی محمود آباد قدر شناسی کرتے رہے لیکن نامساعدتِ روزگار نے پیچھا نہ چھوڑا۔ ۱۹۰۶ء میں کلکتہ کا سفر درپیش ہوا اور وہاں سفارتخانہ ایران میں پرائیوٹ سکریٹری کی جگہ مل گئی۔ نومبر ۱۹۰۸ء میں شاعرِ دربار میر تجمل حسین کے قائم مقام تجویز کیے گئے اور محمود آباد بلا لیے گئے۔ چنانچہ اب تک اسی خدمت پر

فائز ہیں۔ ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔

سمجھے نہ آپ دیدۂ خونبار دیکھ کر — کیا کیجئے گا حالِ دلِ زار دیکھ کر
محشر میں کوئی پوچھنے والا تو مل گیا — رحمت بڑھی ہے مجھ کو گنہگار دیکھ کر
ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں — ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر
پتھر نہیں، کہ طور کے وار آزمائے جائیں — اے برقِ حسن حالِ دلِ زار دیکھ کر
روتا ہوں وقتِ نالہ گزرنے سے اور بھی — شب کو طلوعِ صبح کے آثار دیکھ کر
وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فرازِ دہر — جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر
کہتے ہیں دل لگی مری شامِ فراق کو — اچھا یونہی سہی، مگر اک بار دیکھ کر

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے — سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے
آئیے حالِ دلِ مجروح، سنئے، دیکھئے — کیا کہا زخموں نے کیوں ٹانکے صدا دینے لگے
کس نظر سے آپ نے دیکھا دلِ مجروح کو — زخم جو کچھ بھر چلے تھے پھر ہوا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

وہی رات میری، وہی رات ان کی — کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے
میں بیدار ہوں، سو رہا ہے مقدر — وہ نیند اب نہ آئے گی جو ہٹ گئی ہے
نظارہ دمِ ذبح کرلے تو مرنا — کہ زلف انکے چہرے سے کچھ ہٹ گئی ہے
غمِ دل کی روداد پوچھو نہ ثاقب — اسی حال میں زندگی کٹ گئی ہے

آرزو لکھنوی

حالات | سید انور حسین آرزو خلف مرزا میر ذاکر حسین یاس مغفور لکھنوی

۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ بارہ برس کی عمر سے شاعری کا شغل شروع کر دیا۔ فنِ شعر اور مشقِ شعر دونوں میں جلالؔ لکھنوی سے فیض حاصل کیا۔ آرزوؔ ان کے شاگردِ رشید ثابت ہوئے اور جملہ اقسام پر طبع آزمائی کی۔ ایک کتاب "نظامِ اُردو" مرتب کی جو اصولِ زبان پر ایک محققانہ تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو مجموعے "فغانِ آرزو" اور "جہانِ آرزو" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

جو سامنے اب تک آئے نہیں کیوں دھیان میں آئے جاتے ہیں
آنکھوں سے ابھی تک اوجھل ہیں اور جی میں سمائے جاتے ہیں
ان اُلٹی سیدھی باتوں سے ہم تو گھبرائے جاتے ہیں
ڈھارس بھی دئے جاتے ہیں وہ آنسو بھی بہائے جاتے ہیں
ہٹ اپنی اپنی بات کی ہے، دھیان اپنی اپنی آن کا ہے
ہم ہیں کہ تلے ہیں مٹنے پہ وہ ہیں کہ مٹائے جاتے ہیں
اک مرتے ہوئے سے پھیر کے منہ تم اُلٹے رُوٹھ کے بیٹھے ہو
یہ تو ہے گھڑی ایسی جس میں روٹھے بھی منائے جاتے ہیں
جب ان کے جھوٹے اُلہنے بھی سن لینے کو تیار ہیں ہم
چک جائے گا جھگڑا آپس میں، کیوں لوگ بلائے جاتے ہیں
جینا ہے تو دُکھ بھی ہیں سُکھ بھی ہیں، رونا بھی ہے ہنسنا بھی ہے
بین ایک ہی ہوتی ہے جس پر سب راگ بجائے جاتے ہیں
اب آرزوؔ اس پھلواری میں بسنے کا سہارا کوئی نہیں
دو سوکھے تنکے لا کے رکھو تو وہ بھی جلائے جاتے ہیں

حسرت موہانی

حالات سید فضل الحسن حسرت موہانی ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۳ء
علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ زمانۂ طالب علمی سے شا
کا شوق پیدا ہوا اور تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ نو عمری سے انھوں نے تما
شعرائے اُردو کا مطالعہ کیا۔ ان پر تنقیدیں لکھیں اور انتخابات شائع کئے۔ ا
سبب سے فن شعر میں انھیں ایک خاص بصیرت حاصل ہو گئی ۱۹۰۸ء سے جہ
سیاسی معاملات میں حصہ لینے لگے اور اس سلسلہ میں قید و بند کے مصائب بھی بر
کرنے پڑے لیکن خارجی اثرات، عملی جد و جہد اور گرد و پیش کے حالات نے صرف با
طور پر ان کے کلام کو متاثر کیا ہے۔ حسرت ایک عرصہ تک علی گڑھ سے "اُردوئے م
نکالتے رہے۔ اس کے بعد اُردو کے تمام ممتاز قدیم و جدید شعراء کے دیوانوں کا انت
کرکے "انتخابِ سخن" کے نام سے شائع کیا۔ شاعری کے متعلق اور بھی چند مفید کتا
لکھیں اور اپنی غزلیات کے چار دیوان مرتب کئے۔

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں — ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز — تجھ کو آخر آشنائے نازِ بیجا کر دیا
اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار — اس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا
عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے — مہر ذروں کو کیا، قطروں کو دریا کر دیا

سب غلط کہتے ہیں لطفِ یار کو وجہِ سکوں   دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا
رنگ سوتے ہیں چمکتا ہے طرحداری کا   طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
پایۂ عشرت بے حد ہے غمِ قیدِ وفا   میں تنا سا بھی نہیں رنجِ گرفتاری کا

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں   آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں
بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو   ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں
التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا   سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے   وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد   ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد   جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

روشِ حسنِ مراعات چلی جاتی ہے   ہم سے اور اُن سے وہی بات چلی جاتی ہے
اس جفا جو سے بہ ایمائے تمنا اب تک   ہوسِ لطف و عنایات چلی جاتی ہے
ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن   کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے

ڈاکٹر اقبال

حالات ڈاکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۵ء - ۱۹۲۸) سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ وہیں انگریزی پڑھی اور سید میر حسن سے فارسی اور عربی کی تکمیل کی شعر کہنے کا شوق شروع ہی سے طبیعت میں تھا چنانچہ ارشد گورگانی سے استفادہ کیا۔

داغ سے تحریری اصلاح لی اور مرزا غالب سے معنوی فیض حاصل کیا۔ لاہور سے ایم۔ اے کیا۔ پروفیسر آرنلڈ سے فلسفہ سیکھا۔ حمایتِ اسلام کے جلسوں میں شرکت کی اور قومی نظمیں لکھیں۔ اس کے بعد مخزن کے لئے کچھ نظمیں لکھیں جن میں وطنیت کا عنصر غالب ہے۔ ۱۹۰۵ء میں ولایت گئے اور وہاں میگ ٹیگرٹ، براؤن، نکلسن اور سارلی کی رہنمائی میں حیرت انگیز ترقی کی۔ مشرقی اور مغربی علوم کا تنقیدی نگاہ سے مطالعہ کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے علمی تحقیقات کے عوض فلسفۂ اخلاق کی ڈگری حاصل کی اور میونخ یونیورسٹی نے فلسفۂ ایران پر ایک محققانہ کتاب لکھنے کے صلہ میں "ڈاکٹر آف فلاسفی" کی ڈگری عطا کی، انگلستان میں اسلام کی حقیقت پر چھ لکچر دئے جو بہت مقبول ہوئے اور آرنلڈ کی جگہ پر لندن یونیورسٹی میں ۶ مہینہ عربی کے پروفیسر بھی رہے۔

یورپ میں اقبال کی شاعری کا زاویۂ نگاہ بدل گیا۔ مغرب کی مادّہ پرستی اور اس کی خرابیوں کے راز ان پر منکشف ہوگئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسلامی فلسفہ کی تحقیق نے انھیں حقیقی اسلام اور مسلمانوں کی دیرینہ عظمت سے باخبر کر دیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے قرآن کے فلسفہ ہی کو انھوں نے اپنی شاعری کا محور بنا لیا۔ اب ہندی مسلمانوں کے بجائے تمام اسلامی دنیا ان کی طرف مخاطب تھی۔

یورپ سے آنے کے بعد انھوں نے لاہور میں بیرسٹری شروع کر دی۔ ان کی شاعری کی عالمگیر مقبولیت سے متاثر ہو کر گورنمنٹ نے انھیں سر کا خطاب دیا۔ علی گڈھ، پنجاب اور الہ آباد نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں اور آکسفورڈ یونیورسٹی نے روڈس ٹرسٹ کی طرف سے فلسفیانہ لکچر دینے کے لئے مدعو کیا۔ اُردو میں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز ان کے مشہور

مجموعے ہیں، فارسی کی کئی کتابیں ہیں جن کی شہرت ہندوستان سے نکل کر تمام
متمدن دنیا تک پھیل چکی ہے۔

گیسوئے تابدار کو اور بھی تاب دار کر — ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں — یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر
ئمۂ نوبہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو — اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر
غ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں؟ — کار جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر
وز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل — آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

ب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
طار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحرگاہی
مید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ — کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی
ے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
را و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
ین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اعت نہ کر عالم رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اک مقام سے آگے گذر گیا مہ نو — کمال کسی کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہوا بھی تو کیا — جسے نصیب نہیں آفتاب کا پ
نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی — کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پ
پنپ سکا نہ خیاباں میں لالۂ دلسوز — کہ ساز گار نہیں یہ جہانِ گندم و

فانی بدایونی

حالات محمد شوکت علی خاں فانی سنہ ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ قصبہ اسلام نگ ضلع بدایوں وطن ہے۔ عربی اور فارسی کی کچھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی کی طرف توجہ کی اور سنہ ۱۹۰۱ء میں بریلی کالج سے بی۔ اے اور سنہ ۱۹۰ میں علی گڈھ سے ایل۔ ایل۔ بی پاس کیا۔ لکھنؤ اور بریلی میں وکالت کی۔ آخر زما میں یمین السلطنت سرکشن پرشاد بہادر نے حیدرآباد بلا لیا تھا لیکن موت نے زیادہ دن حیدرآباد سے مستفید نہ ہونے دیا۔

فانی کو کسی سے تلمذ حاصل نہیں تھا۔ کم عمری سے شعر و سخن سے دلچسپی تھی سنہ ۱۸۹۹ء میں ان کا ایک دیوان اور سنہ ۱۹۰۶ء میں دوسرا دیوان مرتب ہوا لیکن یہ دونوں ضائع ہو گئے۔ سنہ ۱۹۰۶ء کے بعد سے وہ سخت پریشانیوں میں مبتلا رہے جس کی وجہ سے ان کی طبیعت پر یاس و حزن کا رنگ چھا گیا۔

حال میں انجمن ترقی اردو ہند نے ان کے قدیم و جدید کلام کا مکمل مجموعہ "عرفانیاتِ فانی" کے نام سے شائع کیا ہے۔

وق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

لِ گل آئی، یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

بجے کیا دامن کی خبر اور دستِ جنوں کو کیا کہیے
اپنے ہی ہاتھ سے دل کا دامن مدت گذری چھوٹ گیا

زلِ عشق پہ تنہا پہونچے، کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

قطرۂ دریائے آشنائی ہے — کیا تری شانِ کبریائی ہے
تری مرضی جو دیکھ پائی ہے — خلش درد کی بن آئی ہے
وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا — نارسائی سی نارسائی ہے
کون دل ہے جو دردمند نہیں — کیا ترے درد کی خدائی ہے
جلوۂ یار کا بھکاری ہوں — شش جہت کاسۂ گدائی ہے
موت آتی ہے تم نہ آؤگے — تم نہ آئے تو موت آئی ہے
بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے — کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے
ترکِ امید بس کی بات نہیں — ورنہ امید کب بر آئی ہے

مژدۂ جنت وصال ہی موت | زندگی محشر جدائی ہے
آرزو پھر ہے درپئے تدبیر | سعیٔ ناکام کی دُہائی ہے

موت ہے ساتھ دے تو دے فانیؔ
عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

عزیزؔ لکھنوی

حالات مرزا محمد ہادی عزیزؔ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں انتقال فرمایا۔ عربی و فارسی کے درسیات کی تحصیل کی۔ شعرگوئی طالب علمی ہی کے زمانہ سے شروع کر دی تھی۔ بعض اساتذہ سے اصلاح بھی لی۔ لیکن زیادہ تر قدیم مشاہیرِ سخن کے کلام کو اپنا اپنا اُستاد بنایا۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں ناسخی رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ اس لئے عزیزؔ نے اپنی غزل کی بنیاد اسلوب اور افکار پر رکھی اور اس میں متانت، واقعیت، تازگی اور شگفتگی پیدا کر دی۔ عزیزؔ نے غالبؔ کا غائر مطالعہ کیا ہے اور ان کی غزل پر کثرت سے غزلیں لکھی ہیں۔

عزیزؔ عباس علی خاں مرحوم رئیس لکھنؤ کے معتمد خاص رہے۔ پھر امین آباد ہائی اسکول میں مدرّسی کے عہدہ پر مامور ہو گئے لیکن آخر زمانہ تک توجہ علمی و ادبی خدمات کی طرف مبذول رہی۔ منظوم تصانیف میں گلکدہ، قصائدِ عزیزؔ اور صحیفۂ ولا شائع ہو چکے ہیں۔

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا　　وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا
جی نہ اٹھوں گا ہے بیکار پشیماں ہونا　　جاؤ اب ہو چکا جو کچھ تھا مری جاں ہونا
حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گذرے ہیں　　مرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا
سرخ ڈورے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ　　چاہیئے تھا انھیں پیوست رگِ جاں ہونا
ہو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور　　قہر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ہونا

وہ نگاہیں کیا کہوں کیوں کر رگِ جاں ہو گئیں
دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہو گئیں
تھیں جو کل تک جلوہ افروزی سے شمعِ انجمن
آج وہ شکلیں چراغِ زیرِ داماں ہو گئیں
ب نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اُس شوخ نے
ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہو گئیں
ن کی شامِ غم پہ صدقے ہو مری صبحِ حیات
جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

پہلے آئینہ اک نظر دیکھو　　پھر مرا دل مرا جگر دیکھو
قتل اور مجھ سے سخت جاں کا قتل　　تیغ دیکھو ذرا کمر دیکھو
کہہ کے بیمار سے یہ بجھ گئی شمع　　رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو
پوچھتے کیا ہو اپنا جذبِ نگاہ　　اک خدائی ہے تم جدھر دیکھو

بادہ آشام جھومتے اُٹھے وہ کھلا میکدہ کا در دیکھو
دیدنی ہے عزیزؔ کا بھی جنوں
کس طرح پھوڑتا ہے سر دیکھو

متفرق اشعار

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن (۱) بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
شیشۂ دل کو یوں نہ اُٹھاؤ (۲) دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا

اصغرؔ گونڈوی

حالات اصغر حسین اصغرؔ گونڈوی ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں انتقال فرمایا۔ ابتدائی تعلیم و تربیت معمولی ہوئی۔ انٹرنس کا امتحان خانگی پریشانیوں کی وجہ سے نہ دے سکے۔ ذاتی مطالعہ سے عربی، فارسی اور انگریزی میں کافی بصیرت حاصل کر لی تھی۔

شاعری میں کسی کے مستقل شاگرد نہیں ہوئے۔ شروع میں بعض غزلیں وجہ بلگرامی اور تسلیم لکھنوی کو دکھلائیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے شرفِ بیعت حاصل تھا اس لئے اُن کے کلام میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔
اصغرؔ ایک عرصہ تک گونڈہ میں چشمہ سازی کے کام پر مامور رہے۔ اس کے بعد

ہندوستانی اکاڈمی سے وابستہ ہو گئے اور اپنے دو مجموعے "نشاطِ روح" اور "سرودِ زندگی" شائع کئے۔

صحنِ حرم نہیں ہے یہ کوئے بتاں نہیں — اب کچھ نہ پوچھئے کہ کہاں ہیں کہاں نہیں
مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت — اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں
سارا حصولِ عشق کی ناکامیوں میں ہے — جو عمر رائیگاں ہے وہی رائیگاں نہیں
ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انھیں سے فاش — آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں
فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح — لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

خدا جانے کہاں ہے اصغرِ دیوانہ برسوں سے
کہ اس کو ڈھونڈتے ہیں کعبہ و بتخانہ برسوں سے
تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہونا ہے
یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے
کوئی ایسا نہیں یارب کہ جو اس درد کو سمجھے
نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے
ترے قربان ساقی اب وہ موجِ زندگی کیسی
نہیں دیکھی ادائے لغزشِ مستانہ برسوں سے
مری رندی عجب رندی، مری مستی عجب مستی
کہ سب ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے
لباسِ زہد ہو پھر کاش نذرِ آتشِ صہبا
کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأتِ رندانہ برسوں سے

جگر مرادآبادی

حالات علی سکندر جگر مرادآبادی کی ولادت تقریباً ۱۸۹۰ء میں ہوئی شاہجہاں کے زمانہ میں جگر کے بزرگ مرادآباد آباد ہوگئے۔ ان کے والد مولوی علی نذر خواجہ وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے اور صاحب دیوان تھے جگر کو اعلیٰ تعلیم کا موقع نہ مل سکا لیکن فنِ شعر میں اپنی خداداد قابلیت اور ذوقِ سلیم سے جلد شہرت حاصل کی ابتدا میں رسا بلند شہری، داغ دہلوی اور تسلیم لکھنوی سے فیضِ تلمذ حاصل کیا لیکن یہ سلسلہ جلد ہی منقطع ہوگیا۔ اب جو اُن کے کلام کا رنگ ہے وہ ان کی خصوصیت ہے۔
جگر کے دو مجموعے "داغِ جگر" اور "شعلۂ طور" شائع ہو چکے ہیں۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

وہی قیامت ہے قدِ بالا، وہی ہے صورت وہی سراپا
لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش، کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

وہی لطافت، وہی نزاکت، وہی تبسم، وہی ترنم،
میں نقشِ حرماں بنا ہوا ہوں وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں

خرام رنگیں، نظام رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پر روش روش پہ نئے نئے رنگ کھلا رہے ہیں

شراب رنگیں، جمال رنگیں، وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں، تمام رنگیں بنا رہے ہیں

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے، نظر سے مستی اُبل رہی ہے
چھلک رہی ہے، اچھل رہی ہے، پئے ہوئے ہیں، پلا رہے ہیں

تمام ہے سبزہ زار عالم، بہار اندر بہار عالم
خود اپنے پہ ہے نثار عالم، غضب یہ عالم دکھا رہے ہیں

وہ روئے رنگیں وہ موجۂ یم کہ جیسے داماں گل پہ شبنم
یہ گرمیٔ حسن کا ہے عالم، عرق عرق ہیں نہا رہے ہیں

تمام رنگینیوں کے منظر، تمام رعنائیوں کے مظہر
سنبھل سنبھل کر، سمٹ سمٹ کر، سب اپنے مرکز پہ آ رہے ہیں

بہار و رنگ و شباب ہی کیا، ستارہ و ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں

فضا سے نشہ برس رہا ہے، دماغ پھولوں میں بس رہا ہے
وہ کون ہے جو ترس رہا ہے سبھی کو پی خود بنا رہے ہیں

یہ موج و دریا، یہ رنگ و صحرا، یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں، یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

اب آگے جو کچھ کہ ہو مقدّر، رہے گا لیکن یہ نقش دل پر
ہم اُن کا دامن پکڑ رہے ہیں، وہ اپنا دامن چھڑا رہے ہیں

یہ اشک جو بہہ رہے ہیں اگرچہ سب ہیں حاصل غم

مگر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے کچھ مسکرا رہے ہیں
خوشی سے لبریز شش جہت ہے، زبان پر شورِ تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے جگرؔ کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

فراقؔ گورکھپوری

حالات پروفیسر رگھوپتی سہائے فراقؔ ایم، اے کی پیدائش ۱۸۹۶ء میں ایک کایستھ گھرانے میں ہوئی۔ ایم۔اے تک برابر چوٹی کے کامیاب طلباء میں رہے۔ بی۔اے کے بعد ہی ڈپٹی کلکٹری کی ملازمت ملی اور آئی سی ایس کے لئے نامزد ہوئے لیکن عدم تعاون کی تحریک میں ملازمت چھوڑ دی اور ڈیڑھ برس قیدِ محض کی سزا کاٹی۔ اس کے بعد پرائیوٹ طور پر انگریزی میں ایم۔اے کیا اور اس میں اوّل رہے۔ کچھ دنوں تک لکھنؤ اور کانپور میں اُردو کے پروفیسر رہے۔ اب الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے معلّم ہیں۔

فراقؔ کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرتؔ، میرؔ، غالبؔ، حالیؔ اور فارسی شعراء کے کلام سے متاثر تھے لیکن ان کی صحبت میں شاعری کا کبھی ذکر نہیں رہا۔ البتہ اُنکے پھوپی زاد بھائی منشی راج کشور لال سحرؔ نے انھیں امیرؔ و داغؔ کے کلام سے روشناس کرایا۔ ۱۹۱۸ء کے بعد سے فراقؔ نے فارسی شعراء اور اُردو میں میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، حالیؔ، عزیزؔ، شادؔ، یاسؔ، حسرتؔ کے کلام کا غائر نظر سے مطالعہ کیا اور دردؔ دہلوی کی

شاعری سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ چنانچہ اُن کے جانشین فراقؔ ہی کے تخلص پر اپنا تخلص رکھ لیا۔ ابتدا میں دو چار غزلیں ناصری مرحوم اور پھر وسیم مرحوم کو دکھلائیں۔ لیکن سنہ ۱۹۲۳ء کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور اس کے بعد اپنے طور پر غزلیں کہنا شروع کیں۔ فراقؔ کم لکھتے ہیں اور دی ہوئی طرحوں کے بجائے اپنی زمینوں میں زیادہ سہولت کے ساتھ کہتے ہیں۔ غزل کے بہت مدّاح ہیں اور مفکرانہ اور حقیقی زندگی کو سماجی زندگی سے غیر متعلق نہیں سمجھتے۔

حسن کے جلوے کر عیاں عشق کی ظلمتیں نہ دیکھ
تو ہے خود ایک داستاں غم کی عبارتیں نہ دیکھ

پھر بھی تو حسن حسن ہی، پھر بھی تو عشق عشق ہی
اپنی عنایتوں کو سوچ، میری شکایتیں نہ دیکھ

گرد و غبارِ دہر کو حسن کو جلوہ زار کر
سینۂ کائنات کی مجھ سے کدورتیں نہ دیکھ

برقِ نگاہ کے نثار، فکرِ سکونِ عشق کیا
جلوۂ صبحِ حشر بن، میری قیامتیں نہ دیکھ

غم کدۂ مجاز میں، عالمِ سوز و ساز میں
غفلتِ صد نشاط بن، درد کی کثرتیں نہ دیکھ

ذوقِ نظر بھی ترک کر، جذبِ نہاں سے بھی گذر
غم کے اشاروں پہ نہ جا، حسن کی شدتیں نہ دیکھ

آج خطائے عشق پر آہ یہ تیری بے دلی
اپنی مروتیں نہ دیکھ، اپنی رعایتیں نہ دیکھ

پاؤں کی تھرتھری کو دیکھ، دیکھ یہ نالۂ جرس
راہگذرِ عشق میں چھوٹتی ہمتیں نہ دیکھ

غفلتِ دائمی سے جاگ، عشرتِ بیخودی سے بھاگ
تجھ سے ہی آسماں کو لاگ، دھوکے کی راحتیں نہ دیکھ

بڑھنے دے میری بیخودی، ہٹنے دے اسکو بے حجاب
اے غمِ ہجر عشق کی حسن کی نسبتیں نہ دیکھ

غم کدۂ فراق میں کیا ہوئیں تیری غفلتیں
پھیر نگاہِ آشنا، میری مصیبتیں نہ دیکھ

مرسلہ پروفیسر فراق گورکھپوری

منظوماتِ جدید

حالی پانی پتی

ننگِ خدمت

نوکری ٹھہری ہے لے دے کے اب اوقات اپنی
پیشہ سمجھے تھے جسے ہو گئی وہ ذات اپنی
اب نہ دن اپنا رہا اور نہ رہی رات اپنی
جا پڑی غیر کے ہاتھوں میں ہر اک بات اپنی
ہاتھ اپنے دلِ آزاد سے ہم دھو بیٹھے   اک دولت تھی ہماری سو اُسے کھو بیٹھے

کرتے ہیں قصدِ تجارت تو گرہ میں نہیں دام
دستکاری کو سمجھتے ہیں کہ ہے کارِ عوام
نہیں حل جوتنے میں راحت و آرام کا نام
بنتے پھرتے ہیں اسی واسطے اک اک کے غلام
نظر آتی نہیں مطلب کی کوئی گھات ہمیں   وہ پڑا نقشہ کہ ہر حال میں ہے مات ہمیں

ایک آقا ہو تو خدمت کا ہو حق اس کی ادا
ایک افسر ہو تو حکم اس کا کوئی لائے بجا
زید کی رائے جدا عمرو کی تجویز جدا
ایک بندہ کو بھگتنے کئی پڑتے ہیں خدا
بھاگو خدمت سے کہ اچھا نہیں انجام اس کا
جس کا پتھر کا کلیجہ ہو وہ لے نام اس کا

کہیں بہتان کا اندیشہ، کہیں بیم گناہ
کہیں غماز کا دھڑکا کہیں خوفِ بدخواہ
جھیلنے روز وہ افسر کہ نہ ہو جس سے نباہ
خدمت اک بارِ گراں ہے کہ عیاذاً باللہ
پڑے پتھر پہ تو پتھر پہ گرانی نہ رہے
گزرے دریا پہ تو دریا میں روانی نہ رہے

آتیں ہیں نوکروں کے سر پہ بلائیں اکثر
بے سبب ان پہ گذرتی ہیں جفائیں اکثر
ماننی پڑتی ہیں ناکردہ خطائیں اکثر
سامنے جاتے ہیں پڑھ پڑھ کے دعائیں اکثر
غیرت آئی جنھیں وہ ٹھیرنے پاتے نہیں یاں
جو کہ عاقل ہیں کبھی کان ہلاتے نہیں یاں

جن کو منظور ہے مشکل کو نہ دشوار کریں
چاہیئے سعی و مشقت سے وہ عار کریں
ہو میسر جنھیں وہ خدمتِ سرکار کریں
ورنہ مزدوری و محنت سرِ بازار کریں

آبرو اس میں ہے شان اسمیں ہے عزت اسمیں　　فخر اسمیں ہی شرف اسمیں شرافت اسمیں

پیشہ سیکھیں کوئی فن سیکھیں صناعت سیکھیں
کاشتکاری کریں۔ آئین خلافت سیکھیں
گھر سے نکلیں کہیں آداب سیاحت سیکھیں
الغرض مرد بنیں جرأت و ہمت سیکھیں

کہیں تسلیم کریں جا کے نہ آداب کریں　　خود وسیلہ بنیں اور اپنی مدد آپ کریں

اکبر الہ آبادی

دریا کی روانی

(سودے کی انگریزی نظم کا ترجمہ)

جو تھیں دقتیں کہہ چکا برملا　　غرض دیکھئے اب یہ پانی چلا
اُچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا　　اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا　　رُکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا　　چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا　　یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
بھٹکتا ہوا غل مچاتا ہوا　　وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا　　یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
اِدھر جھومتا اور مٹکتا ہوا　　اُدھر گھومتا اور اٹکتا ہوا

بپھرتا ہوا، جوش کھاتا ہوا بگڑ کر وہ کف منہ میں لاتا ہوا
وہ اونچے سُروں میں تمتّج کا راگ وہ خود جوش میں آ کے لاتا یہ جھاگ
سُدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا تھرکتا ہوا رقص کرتا ہوا
اِدھر گونجتا گنگناتا ہوا اُدھر خود بخود جھنجھناتا ہوا
لپٹتا ہوا اور چمٹتا ہوا یہ پھٹتا ہوا وہ سمٹتا ہوا
سماتا ہوا اور پلٹتا ہوا سرکتا ہوا اور ہلتا ہوا
یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا اُترتا ہوا اور چڑھتا ہوا
پھسلتا ہوا اور ڈگمگاتا ہوا لچکتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا
لرزتا ہوا، تلملاتا ہوا بلکتا ہوا اور بلبلاتا ہوا
بلندی سے گرتا گراتا ہوا نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہوا
اُچکتا ہوا اور اُڑتا ہوا اٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا
وہ کھیتوں میں راہیں کرتا ہوا زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا
چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا سنبھلتا ہوا اور چھلکتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا
تڑپتا ہوا جگمگاتا ہوا شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا
یونہی الغرض ہے یہ پانی رواں بس اب دیکھ لیں شاعر نکتہ داں

ظریفانہ رنگ

۱۔ نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکمرانی نہ وہ وضع ملت نہ قرآن خوانی

نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی　یہی کہتی پھرتی ہے لڑکے کی نانی
ہر اک شاخ میں پاسِ لے بوا ہے　مرا لال کالج کا کاکا توا ہے

۲۔ بابو کہنے لگے بحث پہ لڑو　ملک کو دیکھو اپنے حق پہ لڑو
کہہ دیا صاف ہم نے لے مہراج　ہو مبارک تمہیں یہ کام یہ کاج
ما شکیبانِ کوئے دلدا ریم　یا ڈپوٹیشن ست یا غم نیم

۳۔ بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

۴۔ شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

۵۔ ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

۶۔ حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

۷۔ ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی۔اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی پھر مر گئے

اسمٰعیل میرٹھی

حالات مولانا اسمٰعیل میرٹھی (۱۸۴۴ء-۱۹۱۷ء) مدرسۂ سرکاری میں ملازم رہے اور نارمل اسکول آگرہ کی ملازمت سے پنشن لی۔ چونکہ ان کا تعلق ابتدا ہی سے درس و تدریس سے رہا تھا اس لئے انھیں بچّوں کی سمجھ کے معیار اور اُنکی نفسیات کے سمجھنے کا بڑا اچھا موقع ملا۔ اسی لئے ان کا لائق یادگار کارنامہ بچّوں کی تعلیمی کتابیں اور نظمیں ہیں۔ اسمٰعیل نے بچّوں کی نظموں کے علاوہ گردوپیش کے حالات سے متاثر ہو کر بہت سی نیچرل، قومی، مذہبی اور ادبی نظمیں بھی لکھیں۔ نظم بے قافیہ کی بے رنگی کو اُردو میں گوارا اور پسندیدہ کرنا انھیں کا کام ہے۔ اُن کا کلیات اُن کے صاحبزادے خان بہادر اسلم سیفی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

بارش کا پہلا قطرہ

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی — پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ — ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب ہو گا — میں اور کے کوں آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس — اپنی ہی کروں گا ستّیاناس

آتی ہے برسنے سے مجھے شرم　　مٹی پتھر تمام ہیں گرم
خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت　　پھیکی باتوں میں کیا حلاوت
کس برتے پہ کروں دلیری　　میں کون ہوں کیا بساط میری
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہی غم　　سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی　　کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی
اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور　　ہمت کے محیط کا شناور
فیاض و جواد و نیک نیت　　بھڑکی اُس کی رگِ حمیت
بولا للکار کر کہ آؤ　　میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہو سکے کچھ احساں　　ڈالو مردہ زمین میں جاں
یارو یہ ہچر مچر کہاں تک　　اپنی سی کرو بنے جہاں تک
مل کر کروگے جانفشانی　　میداں میں پھیر دوگے پانی
کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں　　آتے ہو تو آؤ لو چلا میں
یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ　　دشوار ہے جی پہ کھیل جانا
ہر چند کہ تھا وہ بے بضاعت　　کی اُس نے مگر بڑی شجاعت
دیکھی جرأت جو اس سخی کی　　دو چار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا　　قطرہ قطرہ زمیں پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار　　بارش لگی ہونے موسلا دھار

پانی پانی ہوا بیاباں
سیراب ہوئے چمن خیاباں

شوق قدوائی

حالات منشی احمد علی شوق نے (۱۹۲۸-۱۸۵۳ء) بدایوں اور رامپور میں تعلیم پائی۔ اسیر لکھنوی سے اصلاح سخن حاصل کی۔ لکھنؤ سے "آزاد" اخبار جاری کیا لیکن کچھ دنوں کے بعد بند ہو گیا۔ آخر میں بھوپال اور رام پور میں ملازم ہو گئے۔ ان کی بہت سی تصانیف یادگار ہیں۔ جن میں ترانۂ شوق (مثنوی)، قاسم و زہرا (منظوم ڈراما) عالم خیال (ایک مسلسل جذباتی نظم) گنجینہ (مجموعۂ منظومات) اور دیوان غزلیات مشہور ہیں۔ شوق سلیس اور مترنم بحریں استعمال کرتے ہیں۔ جذبات نگاری، منظر کشی اور نسوانی زبان لکھنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

طاؤس

طاؤس کا رقص میں وہ آنا
آواز سے کرّنا بجانا

وہ تاج زمردیں سروں پر
سونا سا چڑھا ہوا پروں پر

دُم کا پھیلاؤ حُسن کی شان
گردن کا تناؤ حسن کی شان

ہر پر میں اُداہٹ اور سیاہی
اس میں پھر رنگ سبز کاہی

کیا لطف دکھا رہی ہے زردی
کیا خوب ہے رنگ لاجوردی

زردی کی چمک سے بڑھ گئی شان
سبزی میں چمک سے پڑ گئی جان

پکھراج اس میں، زبرجد اس میں
کندن کا جڑاؤ بیحد اس میں

چلنے پھرنے میں دم پڑی ہے رقصاں ہے تو پہیلی ہے کھڑی ہے

بے نظیر شاہ

حالات سید محمود بے نظیر شاہ وارثی (۱۸۶۳ء-۱۹۳۰ء) کا وطن کڑا مانک پور ضلع الہ آباد تھا لیکن حیدرآباد کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ کچھ دنوں علیگڈھ میں بھی قیام رہا۔ عربی اور فارسی میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ غزل میں وحید اللہ الٰہ آبادی اور مثنوی میں امیر مینائی سے مشورہ لیتے تھے۔ طبیعت پر صوفیانہ رنگ غالب تھا جو اُن کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ جدید اُردو شاعری کی تحریک سے بھی متاثر ہوئے اور بہت سی نیچرل نظمیں لکھیں۔ ایک مثنوی الکلام لکھی جس کا موضوع تصوف اور قصہ فرضی ہے۔ یہ استعارہ کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے اور بہت مقبول ہے۔

چاندنی رات

وہ مہتاب کی آسماں پہ نمود مُزیّن کواکب سے چرخ کبود
وہ کرنوں کی شبنم کے اندر بہار اُڑا یا ہے چاندی کا جیسے غبار
لرزتی ہے پانی پہ یہ چاندنی کہ دریا میں بجلی کی ہے روشنی
وہ لہریں کہیں تلملاتی ہوئی چمک آئینہ کی دکھاتی ہوئی
نہیں نام کو بھی کہیں تیرگی کہ عکس تجلی ہے سائے میں بھی
رواں ہے چار وطرف موج نور کہ اڑتے ہیں دن کیطرح کچھ طیور

شعاعوں کی اللہ رے تیزیاں — قمر کے وہ جوبن کی نوخیزیاں
مگر چھوٹے چھوٹے ستارے ہیں ماند — کہ آج اپنے جلوے دکھا رہی چاند
شعاعوں کا وہ جگمگانا کہیں — ستاروں کا آنکھیں چرانا کہیں
گرا چمن کے پتوں سے نورِ قمر — کہ ہیرے کے ٹکڑے پڑے ہیں ادھر
ہوا پچی کاری کا یہ اہتمام — کہ ہر فرش پہ ہے سنگ موسیٰ کا کام
یہ سائے میں اوراق سے نور کے — کہ گل سنگ موسیٰ پہ بلور کے
کہیں چہچہاتے ہیں کچھ طیور — کہیں شور کوؤں کا ہے دور دور
ستارے جو رہ رہ کے ٹوٹے ادھر — وہ مہتاب کے پھول تھے سربسر
ہوئی چاندنی یہ تجلی فشاں — کہ ہے عالم وجد میں آسماں
صفا بام و در میں سمائی ہوئی — درختوں پہ حسرت سی چھائی ہوئی
یہ کہتا ہے ہر اک شجر کا سکوت
کہ سبحانہ الذی لایموت

سرورؔ جہان آبادی

حالات منشی درگا سہائے سرورؔ جہان آبادی (۱۸۷۳-۱۹۱۰ء) نے فارسی اور طب کی تعلیم حاصل کی۔ متعدد نوکریاں کیں لیکن عمر بھر پریشان اور سرگرداں رہے۔ معاشی تکالیف کا ہجوم تھا۔ اکلوتی بیٹی اور محبوب بیوی کا
۱ انتقال ہوا۔ یہی حادثے اُن کی جواں مرگی کا باعث ہوئے۔ سرورؔ بالکل

"فنا فی الشعر" تھے۔ خوش فکر اور آسان رو واقع ہوئے تھے طبیعت میں بلا کی روانی تھی۔ شاعری میں بہار اور بیان کے شاگرد تھے لیکن غالب اور اقبال کے کلام سے بھی متاثر ہوئے۔

بیر بہوٹی

آہ اے ننھے سے کیڑے نازشِ صحرا ہے تو
دشت میں اک سرخ چھوٹا سا گلِ رعنا ہے تو
صفحۂ ہستی پہ اک نقشِ تحیر زا ہے تو
شعلہ زارِ حسن کی چھوٹی سی اک دنیا ہے تو
برقِ عالم سوز کی ننھی سی ہیکل ہے تو
آتشِ یاقوت کی چھوٹی سی مشعل ہے تو

کچھ عجب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا
سرخ ڈورا ہے کسی چشمِ فسوں پرداز کا
قطرۂ منفعل ہے خونِ کشتگانِ ناز کا
قلب خوں گشتہ ہے مژگاں پر کسی جانباز کا
یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پہ جلوہ گر
جامِ زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

گل بداماں ہے شفق میں جلوۂ تنویرِ حسن
خونِ عاشق یا زمیں پر ہے گریبانگیرِ حسن

یا عقیقِ سرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیرِ حُسن
نقشِ نیرنگ فسوں ہے، یا کوئی تصویرِ حُسن

جلوۂ گُل ہے فضائے وادیٔ پُرخار میں
سُرخ تکمہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں

جلوۂ گُل سے ہے رنگیں روئے زیبائے بہار
نازنیں ہے یا کوئی محوِ تماشائے بہار

یا مئے گُل رنگ سے گلگوں ہے مینائے بہار
یا ہے آغشتہ بخوں داغِ سویدائے بہار

سبزۂ کہسار نے یا لعلِ گلابی کوئی
چُن رہی ہے پھول یا دوشیزۂ رعنا کوئی

ڈاکٹر اقبال

زوالِ حُسن

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں تو نے مجھے کیوں نہ لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دُنیا
شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دُنیا

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

قریب تھا کہ جو یہ گفتگو قمر نے سُنی
فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سُنی

سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو

بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

ستارہ

قمر کا خوف کہ ہے خطرۂ سحر تجھ کو مآلِ حسن کی کیا مل گئی خبر تجھ کو
متاعِ نور کے لٹ جانے کا ہے ڈر تجھ کو ہے کیا ہراسِ فنا، صورتِ شرر تجھ کو
زمیں سے دور دیا آسماں نے گھر تجھ کو مثالِ ماہ اُڑائی قبائے زر تجھ کو
غضب ہے، یہ تری ننھی سی جان ڈرتی ہے تمام رات تری کانپتے گذرتی ہے
چمکنے والے مسافر عجب یہ بستی ہے جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل　　عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

چیونٹی اور عقاب

چیونٹی:- میں پائمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بھی بلند

عقاب:- تو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں نُہ سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں

ظفر علی خاں

حالات مولانا ظفر علی خاں کرم آباد ضلع گجرانوالہ میں سنہ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اسلاف کو شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں دریائے جہلم کے قریب بہت سی جاگیریں حاصل تھیں۔ آپ کے مورثِ اعلیٰ راجہ ملک درویش خاں راجپوت اکبر کے عہد میں مشرف باسلام ہوئے۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے نصر خاں نے دریائے چناب کے کنارے ایک آبادی نصیر آباد کے نام سے قائم کی جو طغیانی

میں تباہ و برباد ہو گئی۔ مولانا ظفر علی خاں کے دادا کو سکھوں سے لڑنا پڑا اور اس لئے ان کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی۔ اس کے بعد ان کا تمام خاندان کرم آباد میں آباد ہو گیا۔

مولانا ظفر علی خاں کے والد کا نام سراج الدین احمد خاں تھا جو ریاست جموں و کشمیر میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے عہدہ پر سرفراز تھے۔ مولانا نے گھر پر تعلیم حاصل کرنے کے بعد وزیر آباد کے مشن اسکول اور پھر علی گڈھ کے مسلم اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۹۳ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڈھ سے بی۔ اے پاس کیا اور بمبئی میں نواب محسن الملک کے پرائیوٹ سکریٹری مقرر ہو گئے۔ وہاں سے سرکار نظام کے محکمۂ عدالت کوتوالی میں عزیز مرزا مرحوم کی اعانت سے مترجم مقرر ہوئے۔ آپ کے والد نے ۱۹۰۳ء میں اخبار زمیندار جاری کیا۔ ۱۹۰۹ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد مولانا نے اداری ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں اور اس کے دفتر کو کرم آباد سے لاہور لے آئے۔ جنگ بلقان اور طرابلس میں زمیندار نے بحیثیت روزانہ اخبار کے بڑی شہرت اور عزت حاصل کر لی۔ اب مولانا ظفر علی خاں نے سیاسیات میں عملی حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ ترکی کے سفر کے بعد ۱۹۱۴ء میں سرکار برطانیہ نے ان کو نظر بند کر دیا۔ رہا ہونے کے بعد مولانا نے "ستارۂ صبح" جاری کیا۔ ۱۹۱۸ء میں مولانا ظفر علی خاں بحیثیت مترجم دار الترجمہ حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ لیکن ایک سال بعد ۱۹۱۹ء میں علیحدہ ہو گئے۔ دسمبر میں امرتسر کانگریس میں شریک ہو گئے اور اس سلسلہ میں ستمبر ۱۹۲۰ء میں چھ سال کے لئے قید کر دیئے گئے لیکن نومبر ۱۹۲۵ء میں رہا ہونے کے بعد نہرو پارٹی کے سرگرم رکن بن گئے۔ ۱۹۲۵ء سے لیکر ۱۹۲۸ء تک زمیندار کو بار بار ضمانتیں ادا کرنی پڑیں وہ

ئی دفعہ بند ہوا لیکن پھر جاری ہو ہو گیا۔
قیام حیدرآباد کے زمانے میں مولانا ظفر علی خاں کو داغ سے بھی تلمذ رہا۔
ان کی شاعری سیاسی تحریکات اور واقعات کا آئینہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ
ان کے کلام میں شیرینی اور رنگینی، جوش اور سلاست جس فراوانی کے ساتھ
موجود ہے اس کی مثال پنجاب کے شاعروں میں بہت کم نظر آتی ہے۔ ادبی آزادی
اور لسانی بے پروائی کی جھلک بھی ان کے یہاں بہت کم ہے یا اصول صحیح اور
سہلِ ممتنع کہنے والوں میں ان کا درجہ بہت ممتاز ہے۔

بارش

ابر تھا چھایا ہوا اور فصل تھی برسات کی
تھی زمیں پہنے ہوئے وردی ہری بانات کی
آفتاب اوڑھے ہوئے تھا چادرِ ابرِ سیاہ
برق کی چشمک زنی سے خیرہ ہوتی تھی نگاہ
بادل اتنے میں دُرِ ناسفتہ برسانے لگے
داستانِ قلزمِ عماں کو دُہرانے لگے
جھوم کر اُٹھی گھٹا، برسی، برس کر پھٹ گئی
گرد کی چادر زمیں کے منہ سے فوراً ہٹ گئی
بادلوں سے نورِ خورشید اِس طرف چھنپنے لگا
سائباں قوسِ قزح کا اُس طرف تننے لگا

سبزہ زاروں میں کلیلیں کرتے پھرتے تھے ہرن
تھا مہابن کا ہر اک کونا، ختن اندر ختن،
جنگلوں میں مست ہو کر ناچتے پھرتے تھے مور
کوہساروں میں چکوروں نے مچا رکھا تھا شور
ڈھل کے پہونچا تھا افق کے آسماں تک آفتاب
تھی شفق کی اس کے منہ پر ایک تاریخی نقاب
یہ نظر آرا مناظر تھے کچھ ایسے دل فریب
ہاتھ سے جاتا رہا دل میرے اور دل سے شکیب
عالم از خود رفتگی کا مجھ پہ طاری ہو گیا
جوش مستی کا مری ہر رگ میں ساری ہو گیا

سیماب اکبر آبادی

حالات شیخ عاشق حسین نام، سلسلہ وارثی سیماب تخلص ۱۸۸۰ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے، عربی اور فارسی کی تکمیل کے بعد گورنمنٹ کالج اجمیر میں انگریزی سے واقفیت بہم پہونچائی۔ ۱۸۹۸ء میں داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے اور کثرتِ مشق سے مہارت پیدا کر لی۔ ۱۹۲۲ء تک ریلوے میں کلرک رہے۔ لیکن ادبی ذوق سے مجبور ہو کر مستعفی ہو گئے۔ پیمانہ اور تاج نکالے اور اب شاعر کے ذریعہ ادبی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

سیماب ڈھائی سو سے زیادہ کتابیں مختلف موضوعات پر لکھ چکے ہیں۔
الہامِ منظوم کے نام سے مثنوی مولانا روم کا اُردو میں ترجمہ فرمایا اور کارِ امروز، کلیم عجم اور نیستاں اپنی غزلوں اور نظموں کے مجموعے شائع کئے۔
سیماب بہت زود گو شاعر ہیں اور تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔

آزادی

وہ اک حورِ مجسّم، صد بہار و صد چمن بردر
نشاطِ دو جہاں در دل، حیاتِ انجمن در بر
سیاہ و مست لمبے بال، پیچ و خم سے بیگانہ
نشیلی انکھڑیاں لیکن مزاقِ رم سے بیگانہ
نگاہیں آسماں کی رفعتوں پر جھومنے والی
جبینِ صاف، معراجِ اُفق کو چومنے والی
خلش گل کی جگر میں اور دل میں درد لالے کا
اِدھر اک ہاتھ میں مسجد، اُدھر گنبد شوالے کا
زباں پہ نغمۂ ناقوس سے تنویر کی موجیں
لبِ خودرنگ پہ مچلی ہوئی تکبیر کی موجیں
ہمالہ کا پری اور طور کا اک جلوۂ رعنا
جو اسکی اک نظر زمزم تو اس کی اک نظر گنگا
غریبوں اور مزدوروں سے ہنس کر بولنے والی
یتیموں اور بیواؤں کے عقدے کھولنے والی

مساوات و رواداری کے جذبے پاک چتون میں
وفاداری و دلداری کے نقشے چلبلے پن میں
فضا کی وسعتوں میں اُڑنے والی اک ردا سر پہ
ادائیں تیرنے والی ہواؤں کے سمندر پہ
تعصب اور نفرت کے لہو سے دستِ پا رنگیں
وفا کے رنگ سے ہر عشوہ رنگیں ہر ادا رنگیں
تنفس میں نجات اس کے ترنم میں حیات اسکے
تکلم گلستاں اس کا جلو میں کائنات اس کے
سکوں برسا ہوا اس کے تبسم سے محبت کا
شگفتہ تیوروں میں موجزن دریا صداقت کا
شعاعِ حسن لرزاں اسکے فردوسی اشاروں میں
بہار افروز پھولوں میں صباحت ریزہ تاروں میں
زمین و آسماں اس کے حریمِ ناز کے آنگن
مہ و خورشید سے اس کی بساطِ انجمن روشن
چمن اسکے، بیاباں اسکے، کوہ و آبشار اسکے
سمندر اسکے، میداں اسکے، امصار و دیار اسکے
وہ فطرت سے براہ راست رشتہ جوڑنے والی
غلامی اس کے پائے ناز پر دم توڑنے والی
وہ شہزادی ہے میں اسکی محبت کا بھکاری ہوں

وہ آزادی کی دیوی اور میں اُس کا پجاری ہوں

(مُرسلہ مدیرِ "شاعر")

چکبست لکھنوی

حالات برج نرائن چکبست بی۔اے، ایل۔ایل۔بی وکیل (۱۹۲۶-۱۸۸۲ء) کشمیری پنڈت تھے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ نو سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا اور افضل سے فیضِ سخن حاصل کیا۔ چکبست آتش اور انیس کے کلام سے متاثر تھے اور ان دونوں کے رنگ ان کے یہاں نمایاں ہیں۔ انکی شاعری کا ایک بڑا حصّہ وطن اور قوم کی محبت سے لبریز ہے، چکبست نے منظر نگاری کے بھی نمونے پیش کئے اور قومی رہنماؤں کے انتقال پر مرثیے بھی لکھے۔ بلسنہ ۱۹۲۶ء میں دفعتاً فالج کے گرنے سے انتقال کر گئے۔

وطن کی عظمت

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے — دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے

تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے — اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشیدِ پر ضیا کی

کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے تھے جاری — چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری

۲۷۹۶۰

سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں
گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو　　سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا بدن کو
اکبر نے جامِ اُلفت بخشا اس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا اُنکی ہڈیاں ہیں
دیوار و در سے اب تک انکا اثر عیاں ہے　　اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے　　فردوس گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنّت کا رنگ ابتک
شوکت سے بہہ رہا ہی دریائے گنگ ابتک
اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں　　کرتے ہیں رقص ابتک طاؤس جنگلوں میں
ابتک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں　　پستی سی آگئی ہے ہر دل کے حوصلوں میں
گل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حبِّ وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے
برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا　　دُنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا　　اک لاشِ بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حبِّ قومی اس خواب سے جگا دے — بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سُنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے — اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سُرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سروِ چمن مبارک — رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک، گُل کو چمن مبارک — ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلینگے
اس خاک سے اُٹھے ہیں اس خاک میں ملینگے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا — آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرّہ اس منزلِ کہن کا — تُلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

تلوک چند محرومؔ

حالات تلوک چند نام اور محرومؔ تخلّص ہے۔ زادبوم سرزمین پنجاب اور ضلع میانوالی مسکن ہے۔ زیادہ تر تعلق محکمۂ تعلیم سے رہا ہے۔ ایک مجموعہ گنج معانی کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس میں ترجمے منظوم، نصیحتیں اور نیچرل نظمیں ہیں۔

بچّہ کا پہلا احساسِ غم[1]

بچّہ

تنہا تو کھیل کود میں لگتا نہیں ہے دل
اب جلد میرے بھائی کو واپس بلائیے
پھر بھونرے محوِ رقص ہیں پھولوں کے متّصل
بھائی کدھر گیا مرا مجھ کو بتائیے

کیا کیا چمک دکھاتی ہے اُڑ اُڑ کے تیتری
ہوتی شعاعِ مہر میں جب پر فشاں ہے وہ
بھائی بغیر اس سے بھی لگتا نہیں ہے جی
واپس بلائیے اسے اماں کہاں ہے وہ

پھولوں پہ دیکھ آئی ہوئی کیا بہار ہے
جو پھول ہم نے بوئے تھے اماں کنارِ باغ
انگور کی جو بیل ہے وہ بار دار ہے
بھائی مرا کہاں ہے کہ لوٹیں بہارِ باغ

ماں

سُنتا نہیں ہے وہ مرے پیارے تری صدا
افسوس اب نہ وہ رُخِ خنداں دکھائے گا
چہرہ جو کبھی روکشِ صبحِ بہار تھا
روئے زمیں پہ تجھ کو نظر اب نہ آئے گا

---

[1] ایک انگریزی نظم کا ترجمہ۔

سرمایۂ نشاط و خوشی اور مختصر — خالق نے دی تھی اس کو گلِ تر کی زندگی
تنہا ہی اب تو کھیلو گے اے راحتِ جگر — ہے دوسرے جہان میں برادر کی زندگی

بچّہ

پھولوں اور پرندوں سے منھ اپنا موڑ کے — ایسا گیا کہ منھ نہیں پھر دکھائے گا
دن گرمیوں کے ہوتے ہیں اتنا بہت بڑے — کیا میں اسے بلاؤں گا اور وہ نہ آئے گا

اب ہم کریں گے مل کے نہ جنگل کی سیر کیا؟ — جاؤں گا اس کے ساتھ نہ دریا کنار میں
یہ جانتا اگر تو وہ جب میرے ساتھ تھا — کر لیتا اس سے کاش کے اچھی طرح پیار میں

امجد حیدر آبادی

حالات سید امجد حسین نام، امجد تخلص ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صوفی سید رحیم علی ایک خدا دوست بزرگ تھے۔ بیوہ ماں کے زیرِ سایہ پرورش پائی۔ رودِ موسیٰ کی قیامت خیز طغیانی میں ماں، بیوی اور بیٹی سب غرق ہو گئیں۔ امجد کی تعلیم مدرسہ نظامیہ حیدر آباد میں ہوئی۔ پنجاب کے امتحان منشی فاضل میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ سید نادر الدین سے فلسفہ و منطق کی تکمیل کی۔ شعر گوئی کا شعور پندرہ سال کی عمر سے شروع ہوا۔ پہلا پہل دیوانِ ناسخ کا مطالعہ کیا۔ چند معمولی غزلیں حبیب کنتوری کو دکھائیں لیکن یہ

شقیہ کلام اب باقی نہیں۔ رودِ موسیٰ کی طغیانی میں غرق ہوگیا۔ ان کا کلام
مخزن اور نظام المشائخ میں شائع ہوتا رہا۔ بعد میں امجد نے اسے کتابی صورت
میں شائع کیا۔ اس وقت تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) رباعیاتِ امجد دو حصوں میں (۲) ریاضِ امجد دو حصوں میں
(۳) خرقۂ امجد سی پیوند (۴) نذرِ امجد

---

(۱)

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی میں نے

(۲)

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی
طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو
حضرت تم سے دیا سلائی اچھی

(۳)

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے
بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آسان کر دی
دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

(۴)

گیسو میں ہے بل کہ میرے خم کو دیکھو
رُخ ہنستا ہے کہ اس ستم کو دیکھو
اظہارِ کمال میں ہر اک کامل ہے
سب کی یہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو

(۵)

ہم صحبتِ بے خرد پریشان رہا | نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی | نادان کو اُلٹا بھی تو ناداں نہ رہا

رواںؔ اناوی

حالات جگت موہن رواںؔ اناوی ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے ایل۔ایل۔بی پاس کرکے اناؤ میں وکالت شروع کی۔ آغازِ شباب سے شعروسخن سے دلچسپی تھی۔ مرزا عزیزؔ لکھنوی کے شاگرد تھے۔ ۴۵ سال کی عمر میں یکایک انتقال کر گئے۔

---

(۱)

دریا جو نہیں، فضائے بالا بھی نہیں | ذرّہ جو نہیں تو کوہ و صحرا بھی نہیں
اے ہستیٔ بے نوا پہ ہنسنے والے | قطرہ جو نہیں تو موجِ دریا بھی نہیں

(۲)

اسبابِ جہاں سے دل کو بہلائیں ہم | اس طرح کا دل بھلا کہاں پائیں ہم
خلوت میں بھی حیف دل کو ایذا ہی رہی | اب اپنے سے بھاگ کر کہاں جائیں ہم

(۳)

دردِ دل چاک چاک کس سے کہئے | افسانۂ خوابناک کس سے کہئے

دُنیا معلوم انظم دُنیا معلوم   بے وجہ کا انہماک کس سے کہیے

(۴)

کیا تم سے بتائیں عمر فانی کیا تھی   بچپن کیا چیز تھا جوانی کیا تھی
یہ گل کی مہک تھی وہ ہوا کا جھونکا   اک موج فنا تھی زندگانی کیا تھی

(۵)

میرے ساقی شراب صافی دینا   ہو جس سے گناہ کی کچھ تلافی دینا
اُترے نہ خمار زندگی بھر جس کا   ایسی دینا اور اتنی کافی دینا

جوش ملیح آبادی

حالات بشیر حسن خاں جوش ملیح آبادی ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ مشہور علمی خاندان کے فرد ہیں۔ فقیر محمد گویا مصنف بوستانِ حکمت جوش کے اجداد میں تھے۔ جوش کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن عالموں اور شاعروں کی صحبت میسر آگئی اور ذوقِ سلیم کی مدد سے اپنا انفرادی رنگ پیدا کر لیا۔ کچھ دنوں عزیز لکھنوی سے بھی اصلاح لی۔ شاعری کا شوق ابتدائے عمر ہی سے ہے۔ حیدر آباد کے دار الترجمہ میں ایک عرصہ تک ادبی نقاد کی خدمت انجام دیتے رہے۔ وہاں سے علیحدہ ہو کر ۱۹۳۶ء میں دہلی سے کلیم نکالا جو اب بند ہو گیا ہے۔ شاعری کی راتیں، نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، جنون و حکمت اور حرف و حکایات، آیات، نغمات ان کی غزلوں، رباعیوں کے مجموعے ہیں۔ آج کل حرفِ آخر لکھنے

میں مصروف ہیں۔

کسان

جھٹپٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دُور دریا کے کنارے، دُھندلے دُھندلے سے چراغ
زیرِ لب، ارض و سما میں باہمی گفت و شنود
مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دُود
وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ
خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا، دن کی گرمی کا گلا
اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتوں کے درمیاں کا فاصلا
خار و خس پر ایک درد انگیز افسانے کی شان
بامِ گردوں پر کسی کے روٹھ کر جانے کی شان
دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور

پارہ پارہ ابر، سرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں
پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نیم جاں پودوں کو گویا نیند سے آتی ہوئی
یہ سماں اور اک قوی انسان، یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
جس کے ماتھے کے پسینے سے ہے عز و وقار
کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر، تمدن کا چراغ
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل
کون ہل، ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل

قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
خوش نما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سراغ
خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ
دھار پہ جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شامِ زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذرّوں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا
جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں
ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
جس میں آجاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
قطع ہوتی ہی نہیں، تاریکئ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچّوں کے دھندلے آنسوؤں پہ ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی نا امید دیوی کا شباب سوگوار
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائیگا
بے ردا بیوی کا سر، بچّوں کا منھ اترا ہوا

سیم و زر، نان و نمک، آب غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

افسر میرٹھی

حالات حامد اللہ نام، افسر تخلص، میرٹھ کے رہنے والے ہیں اور لکھنؤ میں معلم ہیں، اُنھوں نے اُردو شاعری کو رسمیات سے آزاد کرانے میں بڑی جد و جہد کی ہے اور اُردو میں نئی بحروں کو رائج کیا ہے۔ انکا دل وطن کی محبت سے معمور ہے۔ اس کے حسین اثرات ان کی شاعری میں جابجا ملتے ہیں، ایک مجموعہ پیام روح کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں فطرت نگاری جذبات کی صورت گری اور منظر کشی کے نمونے موجود ہیں۔

چاند

(بچوں کے لئے)

تم ندی پر جا کر دیکھو — جب ندی میں نہائے چاند
ڈبکی لگائے غوطے کھائے — ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند
کرنوں کی ایک سیڑھی لیکر — چھم چھم اُتر آئے چاند
جھولے میں پانی کی لہروں کے — کیا کیا پینگ بڑھائے چاند
ہنس ہنس کر ندی کے اندر — بادلوں کو بھی ہنسائے چاند

جب تم اس کو پکڑنے جاؤ   بادل میں چھپ جائے چاند
پھر چپکے سے نکلا دیکھے،   اور پھر خود کو چھپائے چاند
اب پانی میں جب بیٹھا ہے   کیا کیا روپ دکھائے چاند
چاہے جدھر کو جاؤ افسرؔ
ساتھ تمہارے جائے چاند

چاند اور ہم

چاندنی افسردہ بھی ہے زرد بھی   چھن رہا ہے ہلکا ہلکا درد بھی
کچھ پریشانی ہے ایسی ماہ میں   جیسے کھو جائے مسافر راہ میں
چاندنی میں کوئی شے بیتاب ہے   حسن کا شاید پریشاں خواب ہے
چاند ہے اشکوں سے منہ دھوئے ہوئے   نغمے غم انگیز ہیں سوئے ہوئے
بے سکوں ہے آج کچھ آشفتہ حال   یا تڑپ کے بعد ہے کوئی نڈھال
خامشی جو بہرۂ مہتاب ہے   بولنے کے واسطے بیتاب ہے
چاندنی کا حسن اسکے دم سے ہے
اور محبت اس کو افسرؔ ہم سے ہے

حفیظ جالندھری

حالات خاں صاحب حفیظ جالندھری غلام قادر گرامی کے شاگرد ہیں اقبال کے کلام نے حفیظ کو متاثر کیا ہے لیکن انھوں نے اپنی محنت اور ذہانت سے ایک الگ راہ نکالی ہے۔ حفیظ کا تعلق بہاول پور سے بھی رہا ہے لیکن شاہنامۂ اسلام کی تصنیف کے سلسلہ میں انھوں نے لاہور میں اپنا دفتر اشاعت قائم کر لیا۔ چند سال سے منظوم تاریخ اسلام مرتب کر رہے ہیں۔ شاہنامۂ اسلام کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ حفیظ نے نظم کے دو اور مجموعے نغمۂ زار اور سوز و ساز بھی مرتب کئے ہیں۔

ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح

(یہ اشعار مولانا محمد علیؒ کی وفات پر لکھے گئے)

"شب تاریک، بیم موج، گرد ابے چنیں حائل"
نہنگانِ اجل کی بیٹیں بیداد پر مائل
غضب تھا اک شکستہ ناؤ کا منجدھار میں پھنسنا
وفا کی سسکیاں، قسمت کا رونا، موت کا ہنسنا
فقط اک سرپھرا "ملاح" طوفانوں سے لڑتا تھا
ہوا کے آب کے جنوں کے شیطانوں سے لڑتا تھا

اگرچہ ناؤ میں انبوہ در انبوہ انساں تھے
یہ سب ملّاح کے ہم قوم یعنی مسلماں تھے
یہ سب تھے عقل و جرأت میں ارسطو و سکندر
مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر
چلی جاتی تھی کشتی خشمگیں موجوں سے ٹکراتی
اُبھرتی، بیٹھتی، دبتی، دباتی اور چکراتی
کہیں گرداب کے منہ میں کہیں پر شور دھارے پہ
کبھی اس کے اشارے پر کبھی اسکے اشارے پہ
ہوا کے دوش پر خونخوار عفریتوں کی فوجیں تھیں
پہاڑ اُٹھ اُٹھ کے ٹکراتے تھے یا پانی کی موجیں تھیں
تعجب ہے کوئی پرواہ نہیں تھی ناؤ والوں کو
کہ طوفاں میں نظر آتی تھی خامی "باکمالوں" کو
انھیں معلوم تھا گرداب نے کشتی کو گھیرا ہے
گھڑی بھر میں، یہ بیڑا اب نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
انھیں دعوے تھے بحرِ زندگی میں ناخدائی کے
انھیں گُر یاد تھے گرداب میں مشکل کشائی کے
یہ طوفانوں پہ کرسکتے تھے لکچے دار تقریریں
دکھا سکتے تھے تقریروں میں طوفانوں کی تصویریں
ہوا کا رخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھے

تہِ دریا نہنگوں کی نظر پہچان جاتے تھے
یہ سب جو پاؤں پھیلائے رِ کشتی میں بیٹھے تھے
پُرانے ناخداؤں اور ملاحوں کے بیٹے تھے
مگر وہ "سرپھرا" ملاح تنہا تھا، اکیلا تھا،

اِدھر موجوں کی شدّت تھی، اُدھر پانی کا ریلا تھا
وہ چلاّتا تھا اُٹھو بھائیو آؤ اِدھر آؤ
ذرا ہمت دکھاؤ دست و بازو کام میں لاؤ

اِدھر سیلاب پھر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے
اُدھر گرداب بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے
نہیں ہنگام سونے کا کھڑے ہو جاؤ تن جاؤ
حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ
مبادا ناؤ اب کے اور بھی کمزور ہو جائے
پہ گرداب بلا، شاید وہاں در گور ہو جائے
وہ چلاّیا، وہ چیخا، منتیں کیں، آہ وزاری کی
مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی
نہ آمادہ ہوا کوئی بھی جرأت آزمائی پر
سبھی ہنستے رہے ملاح کی ہرزہ سرائی پر
اِدھر بڑھتی رہی، بڑھتی رہی دریا کی طغیانی
اُدھر گھٹتی رہی، گھٹتی رہی توفیقِ انسانی

شکستہ ناؤ کا ملّاح بے دم ہو گیا آخر
بڑھا کر حوصلہ تن میں لہو کم ہو گیا آخر
گرا دریا میں چپّو، ہاتھ سے پتوار بھی چھوٹی
شکستہ ہو گئے بازو مگر ہمت نہیں ٹوٹی
وہ کشتی کے محافظ ڈھونڈھتا تھا اب بھی یاروں میں
اُنھیں تاکید کرتا تھا اشاروں ہی اشاروں میں
تھکن کا ہو رہا تھا اب اثر آہستہ آہستہ
لگا جھکنے وہ افرازِ سر آہستہ آہستہ
وہی سر جو ہواؤں سے نہ طوفانوں سے جھکتا تھا
نہ فرعونوں سے جھکتا تھا نہ ہامانوں سے جھکتا تھا
نہ جھکتا تھا کبھی میر و وزیر و شاہ کے آگے
وہ سر اک مرتبہ پھر جھک گیا اللہ کے آگے
تعجب سے ردائے ابر میں سے برق نے جھانکا
کہ یہ اک آخری سجدہ تھا اس مردِ مسلماں کا
شکستہ ناؤ میں طوفان کی اس چیرہ دستی میں
وہ اپنا فرض پورا کر چکا تھا بحرِ ہستی میں

اختر شیرانی

حالات آپ کا نام محمد داؤد خاں اور تخلص اختر ہے۔ ۱۹۰۴ء میں ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد پروفیسر محمود خاں شیرانی تقریباً ۱۹۲۴ء میں ریاست ٹونک سے لاہور آئے اور اسلامیہ کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اختر شیرانی نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور مختلف رسائل جاری کئے جس کی بنا پر بحیثیت مدیر اور شاعر کے بڑی شہرت حاصل کی۔ ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

اے عشق کہیں لے چل

اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گہِ عالم سے لعنت گہِ ہستی سے
ان نفس پرستوں سے، اس نفس پرستی سے
دور اور کہیں لے چل
اے عشق کہیں لے چل

ہم پریم پجاری ہیں تو پریم کنہیّا ہے
تو پریم کنہیّا ہے، یہ پریم کی نیّا ہے
یہ پریم کی نیّا ہے تو اس کا کھویّا ہے

کچھ فکر نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
بے رحم زمانے کو، اب چھوڑ رہے ہیں ہم
بے درد عزیزوں سے منہ موڑ رہے ہیں ہم
جس آس پہ جیتے تھے اب توڑ رہے ہیں ہم
اب تاب نہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
یہ جبر کدۂ آزادِ افکار کا دشمن ہے
احرار کا مدفن ہے ابرار کا دشمن ہے
اشرار کا مسکن ہے اخیار کا دشمن ہے
چل یاں سے کہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
آنکھوں تلے پھرتی ہے اک خواب نما دُنیا
تاروں کی طرح روشن مہتاب نما دُنیا
جنت کی سی سرسبز اور شاداب نما دُنیا
للہ وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
سنسار کے اُس پار ایک اس طرح کی بستی ہو
جو قرنوں سے انساں کی صورت کو ترستی ہو

اور جس کے مناظر پہ تنہائی برستی ہو
یوں ہو تو وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
ان چاند ستاروں کے بکھرے ہوئے شہروں میں
ان نور کی کرنوں کی ٹھہری ہوئی نہروں میں
ٹھہری ہوئی لہروں میں سوئی ہوئی لہروں میں
اے خضر حسیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!
ایسی بہشت آئین وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں جینے کے مزے آئیں
لے چل تو وہیں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

روش صدیقی

حالات روش صدیقی بی۔اے جوالاپور ضلع سہارنپور کے رہنے والے ہیں اور عصر حاضر کے عام رجحانات اور ملکی تحریکات سے پوری طرح متاثر ہیں۔ خیال کی سنجیدگی، معنویت اور ملکی ملکی نغمگی اُن کے کلام کا جزو ہیں۔

روشؔ نوجوان شاعر ہیں۔ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظم بھی۔ "فردوس محبت" "ٹوٹا ہوا دل"۔ "ہندوستان"۔ "بس ایک بار خدا کے لئے وہیں لے چل"۔ "حُسنِ لرزاں سے"۔ "طلسمِ خیال" اُن کی مشہور نظمیں ہیں۔

طلسمِ خیال

نہ فریب خوردہ آرزو نہ خراب کیفِ نیاز ہوں
نہ ہلاکِ زہرِ وفا ہوں میں نہ شہیدِ خنجرِ ناز ہوں
مجھے حُسن و عشق سے کیا غرض کہ بعیدِ ذوقِ مجاز ہوں
نہ محبتوں کے لئے ہوں میں نہ عقیدتوں کے لئے ہوں
مگر آج تک نہ یہ کھُل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

مرا عزم وہم سے دُور ہے ہے بلند راہ گذر مری
مرا گھر ہے عرش سے بھی پرے ہو کسی کو خاک خبر مری
جسے قدسیوں نے سُنا نہ تھا اُسے دیکھتی ہے نظر مری
میں تجلّیوں میں مقیم ہوں مجھے ہوش ہے وہ کلیم ہوں
مگر آج تک نہ یہ کھُل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

کہیں فلسفی، کہیں منطقی، کہیں اک طبیب لبیب ہوں
مرا لفظ لفظ ہے جاوداں میں وہ لازوال ادیب ہوں
یہ جہاں ہے جس سے بعید تر میں بہت ہی اس سے قریب ہوں

میں نگاہِ عرش کا رازداں　　میں خدائے فرش کا رازداں
مگر آج تک نہ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

یہ قلمروِ سحر خواب گوں　　مرے جاگنے کا مقام ہے
یہ طلوعِ مہرِ ضیا فشاں کہ　　مری عظمتوں کا پیام ہے
یہ ستارے اور یہ کائنات　　مری زندگی کا نظام ہے
مرے دل میں عرش کی عظمتیں　　ہیں رفیع تر مری وسعتیں،
مگر آج تک نہ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

میں تہ زمیں سے ہوں آشنا　　سرِ آسماں کی خبر مجھے
میں ہر ایک بزم کا رازداں　　ہے ہر ایک جہاں کی خبر مجھے
تری خلوتوں کا شریک ہوں　　ترے آستاں کی خبر مجھے
تری محفلوں میں گیا ہوں میں　　تری منزلوں میں رہا ہوں میں
مگر آج تک نہ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

احسان بن دانش

حالات احسان الحق نام ہے اور احسان تخلص۔ تقریباً ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے ہیں۔ والد کا نام

قاضی دانش علی ہے۔ ان کے پاس ایک معقول جائداد تھی لیکن وہ خود غرض عزیزوں کے قبضہ میں چلی گئی۔ اس وجہ سے احسان کو مزدوری معماری اور باغبانی کے کام کرنے پڑے لیکن انھوں نے کسی میں عار نہ سمجھا۔ حافظ محمد مصطفیٰ سے تھوڑی سی فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد قاضی محمد ذکی کی صحبت میں مطالعہ اور شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ لاہور میں بھی احسان کو بہت سی دقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"بس خوشامد سے چوکیداری حاصل ہو گئی۔ پھر تو میں جنت میں تھا۔ بجلی کی روشنی مفت تھی اور پھر آزاد تنہائی، چاندنی راتوں کی حسین آغوش میں خمیدہ کائنات اور متکلم کوش سکوت .... سبحان اللہ .... بیشمار راتیں تو ایسی گذری ہیں کہ شام سے کتاب پر نگاہ جھکا دی ہے اور صبح کے سورج کی معصوم کرنوں نے عبارت اور نظر کا سلسلہ منقطع کیا ہے ...." اب تعمیر ادب لاہور کے ناظم ہیں۔ اپنی غزلوں اور نظموں کے کئی مجموعے حدیثِ ادب، دردِ زندگی، تفسیرِ فطرات، چراغاں، نوائے کارگر، آتشِ خاموش وغیرہ شائع کر چکے ہیں۔

دیہات کی شام

سرخ سے برسا رہا تھا شام کا رنگیں شباب ۔۔۔ جھک رہا تھا دور کھیتوں کے کنارے آفتاب
سرنگوں تھیں ٹہنیاں شرمائے سے تھے سبزہ زار ۔۔۔ آ رہی تھیں نیند کی پریاں ہواؤں پر سوار
دامنِ شب میں چھپی جاتی تھی فطرت کی امنگ ۔۔۔ چھڑ رہی تھی آبشاروں میں سہانی جلترنگ
اچکی تھیں گاگریں بھر کر حسیں پنہاریاں ۔۔۔ اٹھ رہا تھا گاؤں کے کچے مکانوں سے دھواں
بند کیں ذروں نے آنکھیں آہ رہزن آ گئیں ۔۔۔ رفتہ رفتہ شام کی دیوی کی پلکیں جھک گئیں

راستوں میں ظلمتوں کے سانپ بل کھانے لگے / مست چرواہے چراگاہوں سے بھی آنے لگے
آسماں کے سُرخ جلوؤں پر سیاہی آگئی / جھٹپٹا سا ہو کے ہر شے پر اُداسی چھا گئی
اوڑھ کر اک قبر گوں چادر بیاباں سو گیا / سبز کھیتوں پر خنک سایہ مسلط ہو گیا
عالمِ ایجاد پر افسردگی چھانے لگی / جھونپڑوں سے دودھ دوہنے کی صدا آنے لگی
خامشی پر رنگ آیا۔ شورشِ عالم گئی / آسماں پر انجمِ تاباں کی محفل جم گئی
ظلمتوں میں شام کی دن کا اُجالا کھو گیا / آگ کے چوگرد دہقانوں کا جمگھٹ ہو گیا
ہالیوں کو مل گیا دن بھر کی محنت سے فراغ / ٹمٹمایا گاؤں کی چوپال میں دھندلا چراغ
مشورے ہونے لگے نشو و نما کے باب میں / سادہ دل بہنے لگے اُمید کے سیلاب میں
جن کی ہمت پر تغافل کا اثر ہوتا نہیں / جن کا دامن خونِ پندار سے تر ہوتا نہیں
جن کا گرد رہگذر ہے غازۂ روئے بہار / جن کا شانہ روز سلجھاتا ہے زلفِ روزگار
جنکے تقوے سے ہوسناکی ہے فرسنگوں پرے / شہریوں سے جن کے کھوٹے بھی نکلتے ہیں کھرے
بازوؤں پر جنکے نازاں فطرتِ گلشن طراز / کاوشوں سے جن کی حُسنِ انجمن مائل بہ ناز
وارے دیہات کے سادہ تمدن کی بہار / یاں نہیں ہوتی جوانوں کی جوانی داغدار

دل یہ کہتا ہے فراقِ انجمن سہنے لگوں
شہر کی شورش کو چھوڑ دوں اور یہیں رہنے لگوں

مجاز ردولوی

حالات اسرار الحق نام اور مجاز تخلص ہے۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں ردولی ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ علی گڈھ سے بی۔ اے کیا۔ ابتدائی غزلوں پر فانی بدایونی

سے اصلاح لی۔ اس کے بعد ذوقؔ نے خود رہبری کی۔ "آواز" اور "نیا ادب" کی ادارت میں شریک رہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم کارکن ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں ایک مجموعہ "آہنگ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مجازؔ کی شاعری کی نشو و نما ملک کی پُر آشوب فضا میں ہوئی ہے۔ وہ اشتراکی تحریک سے پوری طرح متاثر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں انقلاب کا اعلان اور اشتراکیت کا پیغام نرم موسیقیت میں سُنائی دیتا ہے۔

رات اور ریل

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی، گھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادیٔ و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دلنشیں
آندھیوں میں مینھ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنم، جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
نونہالوں کو سُناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر لچکتی، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی

نازسے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دولہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی، کانپتی
پٹریوں پر دُور تک سیماب چھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات   شادیانوں کی صدا سے وا
منتشر کر کے فضا میں جا بجا چنگاریاں
دامنِ موجِ ہوا میں پھول برساتی ہوئی
تیز تر ہوتی ہوئی منزل بہ منزل دم بدم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی رُوپ دکھلاتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے
رفعتِ کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی
رعشہ بر اندام کرتی انجمِ شب تاب کو
آشیاں میں طائرِ وحشی کو چونکاتی ہوئی
یاد آ جائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی
ایک رخشِ بے عناں کی برق رفتاری کیساتھ
خندقوں کو پھاندتی، ٹیلوں سے کتراتی ہوئی

پل پہ دریا کے دمادم کوندتی، للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی
کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پہ ریت کے ذروں کو چمکاتی ہوئی
روں کو دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی
جد میں آتی ہوئی
اک پہاڑی پہ دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی،
جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی، فضا میں بال بکھراتی ہوئی
چھیڑتی اک وجد کے عالم میں سازِ سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی
رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی
اپنے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی
خود بخود روٹھی ہوئی، بپھری ہوئی، بکھری ہوئی
شورِ پیہم سے دلِ گیتی کو دھڑکاتی ہوئی،
منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکایک، دوڑ کر
دندناتی، چیختی، چنگھاڑتی، گاتی ہوئی،
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی،
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی، سہمی ہوئی،
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی
تیزیٔ رفتار کے سکے بٹھاتی جا بجا،

دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی
ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب — اک نیا منظر نظر کے سامنے لا
صفحۂ دل سے مٹاتی عہد ماضی کے نقوش — حال و مستقبل کے دلکش خواب دکھا
اک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ دڑاتی ہوئی
اک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی
دامن تاریکیٔ شب کی اڑا کر دھجیاں
قصر ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آجائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
زعم میں پیشانیٔ صحرا میں ٹھوکر مارتی
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سیکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جانفزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر — شاعر آتش نفس کا خون کھولا

وطن سے جن کو محبت نہیں، وہ کیا جانیں؟
کہ چیز کون بدیشی ہے، کیا سُدیشی ہے

اِسی کے سائے میں پاتا ہے پرورش اقبال
مثالِ سایۂ بالِ ہُما سُدیشی ہے

اسی نے خاک کو سونا بنا دیا اکثر
جہاں میں گر ہے کوئی کیمیا، سُدیشی ہے

فنا کے ہاتھ میں ہے جانِ ناتوانِ وطن
بقا جو چاہو تو رازِ بقا سُدیشی ہے

ہوا اپنے ملک کی چیزوں سے کیوں ہمیں نفرت
ہر ایک قوم کا جب مُدعا سُدیشی ہے

انقلابِ دہر

باہمی فسادات کو دیکھ کر

دورِ زماں جو دشمنِ امن واماں ہوا
برہم نظامِ کشورِ ہندوستاں ہوا
جینا یہاں کا باعثِ آزارِ جاں ہوا
دوزخ نمایہ خطۂ جنت نشاں ہوا
کیا انقلابِ دہر کدورت فشاں ہوا
بادِ سحر چلی تو بگولا عیاں ہوا
گھیرا تمام ملک کو نفرت کی آگ نے
دل داغدار کردیئے ناحق کی لاگ نے

اہلِ وطن میں آہ، وہ صدق و صفا کہاں
وہ لطفِ درمیانہ، وہ مہر و وفا کہاں
ہمسائگی کی صحبتِ صبح و مسا کہاں
لیل و نہار اب وہ گئے اے خدا کہاں
لے جائے ہم کو یہ ستمِ نا روا کہاں
اس ابتدا کی دیکھیے ہو انتہا کہاں؟
پائے کہاں سکوں دلِ بیتاب دیکھیے
بیڑا کہاں وطن کا ہو غرقاب دیکھیے
ہمسائے تھے جو صدیوں کے آپس میں لڑ گئے
اِس کُشت و خوں سے بستے ہوئے گھر اُجڑ گئے
قسمت سے آہ! تفرقے یاروں میں پڑ گئے
جو جھک کے ملنے والے تھے باہم، اکڑ گئے
جھگڑے عناد و بغض و عداوت کے گڑ گئے
یہ دیکھ کر اُمید کے پاؤں اُکھڑ گئے
اب تر جو دام و دد سے مکینوں کا حال ہو
اُس گھر پہ کیوں نہ بارشِ تیرِ ملال ہو

لیتے اگر ذرا نگہِ دُور بیں سے کام
آتے نظر نتائجِ کین و حسد تمام
فتنے نہ اُٹھنے پاتے، جو اُٹھتے ہیں صبح و شام
ہوتی نہ اہلِ امن پہ یوں زندگی حرام
رہنا ہے مل کے دونوں کو اِس ملک میں مدام
مِٹتا نہیں ہے کوئی بھی، ہوں لاکھ قتلِ عام
پھرتے ہیں آج جو نفسِ آتشیں لئے
آئیں گے کل نظر عرق افشاں جبیں لئے

پھر بھی لڑتے ہیں!

رُسوا وطن ہُوا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں
پامالِ صد جفا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں
ذلّت کی انتہا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں
لڑنا بہت بُرا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں
دونوں کا اک خُدا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں
خالق ہے ایک دونوں کا معبُود ایک ہے
رستے الگ ہیں، منزلِ مقصُود ایک ہے
اک زادِ بُوم اور زیاں سُود ایک ہے
دونوں کے واسطے رہِ بہبُود ایک ہے
کچھ بھی نہیں جُدا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں

ایماں کا جُزو امن ہے یہ جانتے بھی ہیں!
ممنُوع ہے فساد، اسے مانتے بھی ہیں
امن و اماں کی قدر کو پہچانتے بھی ہیں
یہ بات اپنے دل میں کبھی ٹھانتے بھی ہیں
"اب صلح مُدّعا ہے" مگر پھر بھی لڑتے ہیں!

صدق و صفا کو چھوڑ کے، بن کر سیاہ کار
اک دوسرے پہ کرتے ہیں تیغ و سناں کے وار
بستے ہوئے گھروں کو بناتے ہیں شعلہ زار
خود کو مٹا کے ہوتے ہیں رُسوائے روزگار
لڑنے کی یہ سزا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں!

یہ بھی غلام غیر کے، وہ بھی غلام ہیں!
کرتے ہیں روز و شب جو غلاموں کے کام ہیں
مجبور و بے نوا ہیں کہ پابستۂ دام ہیں
نے پرفشاں ہوا ہیں، نہ بالائے بام ہیں
کُنجِ قفس مِلا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں!

کہتے نہیں کہ کوئی لڑائے تو ہم لڑیں!
لاشیں ہماری کوچہ و بازار میں سڑیں
لڑنے سے باز آئیں جو ہنسی جوتیاں پڑیں
کچھ شرم ہو تو خاکِ حمیّت میں ہم گڑیں
سب کچھ سمجھ لیا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں!

اہلِ وطن ذرا تو کریں دل میں غور ہم
دُنیا کو کیوں دکھاتے ہیں وحشت کے طور ہم
ہندوستاں میں کون سا لاتے ہیں دور ہم
ہوتے ہیں کیوں ذلیل سوا اس سے اور ہم
ذلّت کی انتہا ہے، مگر پھر بھی لڑتے ہیں!

غریب الوطن

لالہ لاجپت رائے کی جلاوطنی پر

وطن کی یاد میں ہوں بے قرار غربت میں
کوئی رفیق نہ مونس، نہ یار غربت میں
قدم کو چومنے آتے ہیں خار غربت میں
بغیر اس کے نہیں کچھ وقار غربت میں
جگر کے داغ ہوئے لالہ زار غربت میں
یہی ہے جوششِ فصلِ بہار غربت میں
دیارِ غیر کو پنجاب ہم بنا دیں گے
ہوئے ہیں دیدۂ تر اشکبار غربت میں

جو دن پہاڑ سا ہے، رات اس سے بھاری ہے
کٹیں تو کس طرح لیل و نہار غربت میں

جگر سے ہُوک اُٹھی آہ! جب کہ یاد آیا
عروسِ صبحِ وطن کا نکھار غربت میں

ہے یاد آتی وہ شبنم وطن کے باغوں کی
غریب روتے ہیں زار و قطار غربت میں

بندھی ہے رشتۂ یادِ وطن میں لے ہمدم
کہاں نکلتی ہے جانِ نزار غربت میں

نسیمِ صبح اُٹھا کر وطن کو لے جانا
خراب ہو نہ ہمارا غُبار غربت میں

وطن کا یار کبھی کوئی شاید آ نکلے
ہیں کب سے بیٹھے سرِ رہگذار غربت میں

کہاں وہ بزمِ رفیقاں، وہ محفلِ یاراں
حواس کو بھی ہوا انتشار غربت میں

جو تیغِ حُبِّ وطن سے وطن میں کھائے تھے
ہوئے ہیں زخم وہی آشکار غربت میں

وطن، تجھے بھی ہمارا ہے درد؟ سچ کہنا
ہیں تیرے غم میں تو ہم سوگوار غربت میں

نسیم! کون کرے اپنی قاصدی تجھ بن
ہے صبح و شام ترا انتظار غربت میں

پیامِ مرگ ہمارا وطن میں دے دینا
نہیں ہے زیست کا کچھ اعتبار غربت میں

غزل

خزاں کا رنگ ہے خاکِ وطن! تیری بہاروں میں
ہجومِ داغِ حسرت دیکھتا ہوں لالہ زاروں میں

اداسی تیرے کُملائے ہوئے پھولوں کی ملتی ہے
چراغِ صبح میں یا آخرِ شب کے ستاروں میں

صدائے گریہ دھیمی دھیمی اب راتوں کو آتی ہے
گئے وہ دن کہ تھا جوشِ ترنم آبشاروں میں

نشاط انگیز اب ساون کی جھڑیاں ہو نہیں سکتیں
کہ عالم تیرِ باراں کا ہے، بارش کی پھواروں میں

یہی عالم رہا گر تیرے ضبطِ سوزِ پنہاں کا
تو پھوٹیں گے بجائے غنچہ شعلے شاخساروں میں

تڑپ کر سنگریزوں سے شرر باہر نکل آئیں
جو تیرا اضطرابِ دل بیاں ہو کوہساروں میں

غم آلودہ نہ ہوں اشعارِ محرومِ حزیں کیوں کر
کہ ہے تاثیرِ غم خاکِ وطن تیرے نظاروں میں

لالہ لاجپت رائے

لالہ جی کے امریکہ چلے جانے پر

اے لاجپت فدائے وطن، دردمندِ قوم
آئی نہ راس اپنے وطن کی ہوا تجھے
لوحِ زماں پہ نقش ہیں قربانیاں تری
فخرِ جہاں سمجھتے ہیں اہلِ وفا تجھے
پردیس میں مقام ترا چشمِ اہلِ دل
اپنے وطن میں گوشۂ زنداں ملا تجھے
پردیس میں تو مسندِ عزت پہ جلوہ گر
پاتے ہیں اپنے گھر میں اسیرِ بلا تجھے

محرومؔ کی طرح ہے ہزاروں کی یہ دُعا
ان دلگدازیوں کا صِلہ دے خدا تجھے

سوزِ وطن

لالہ لاجپت رائے کی بیماری پر

سوزِ وطن نے صورتِ تپ اختیار کی
زنداں میں بند جب وہ محبِّ وطن ہوا
دل کی بھڑاس جب نہ زباں سے نکل سکی
سوزِ نہاں سے وقفِ تب و تابِ تن ہوا

دُعا

شہیدِ وطن لالہ لاجپت رائے سنہ ۱۹۲۲ء میں بعارضہ تپ بیمار ہو گئے
یہ شعر اُس وقت موزوں ہوئے۔

پھر چارہ گرِ وطن کو یا رب — صحت گہِ غیب سے شفا دے
ہیں منتظرِ ظہورِ رحمت — رحمت کا کرشمہ پھر دکھا دے
نیسانِ کرم ہے ذات تیری — چھینٹا کوئی آبِ زیست کا دے
دے اس کو شفا کہ پا کے صحت — مرتی ہوئی قوم کو جِلا دے
خود قیدِ فرنگ سے ہو آزاد — قیدِ غم سے ہمیں چھڑا دے
وہ یوسفِ مصرِ جانِ ملت — پنجاب کے تفرقے مٹا دے
آوارۂ دشتِ گمرہی کو — آ کر رہِ راست پر لگا دے
وہ قافلۂ وطن کا سالار — منزل کا ہمیں پتہ بتا دے
فریادِ جرس صدا ہے جس کی — بچھڑے بھٹکوں کو پھر ملا دے
اک بار بہ فیضِ حسنِ تدبیر — بگڑے ہوئے کام پھر بنا دے

وہ عزتِ ہند کا نگہبان
پھر ہند کو واپس اے خدا دے

تاثیرِ بے گُناہی

لالہ لاجپت رائے کی رہائی پر لاہور کے جلسۂ عام میں پڑھی گئی

ہو رہے ہیں آج کیوں عشرت کے ساماں ہر طرف
جشنِ جمشیدی کے جلوے ہیں نمایاں ہر طرف

آ رہا واپس ہے کوئی رام کیا بن باس سے
ضو فگن بھارت میں ہے نُورِ چراغاں ہر طرف

کس کے قدموں میں یہ آنکھیں بچھ رہی ہیں چار سُو
اُگ پڑے خاکِ وطن سے نرگستاں ہر طرف

بُلبلِ خونیں نوا کوئی یہاں آنے کو ہے
آج ویرانوں میں ہے رنگِ گُلستاں ہر طرف

آمد آمد آج کس گل کی ہے اے اہلِ چمن!
آسماں پر چھا گیا ابرِ بہاراں ہر طرف

ہو رہی ہیں کس کے استقبال کی تیاریاں
منتظر کس کے کھڑے ہیں سرو ریحاں ہر طرف
پھوٹی پڑتی ہے مسرّت، جوش پر ہے انبساط
ہند کے پیر و جواں ہیں آج فرحاں ہر طرف
ماہِ کنعاں آج کنعاں میں ہوا ہے جلوہ گر
حسرتِ دیدار کے نکلیں گے ارماں ہر طرف
ہیں در و دیوار روشن دیپ مالا بھی نہیں
یہ اُجالا چاند سورج کا اُجالا بھی نہیں
مژدہ اے لاہور، اے پنجاب اے ہندوستاں
آسماں قسمت سے تم پر ہو گیا ہے مہرباں
وہ تمھارا چاہنے والا تمھیں پھر مل گیا
جس کی فرقت میں تمھارے لب پہ تھی آہ و فغاں
وہ تمھارا عاشقِ شیدا، تمھارا جاں نثار
جو تمھارے غم میں نکلا چھوڑ کر سب خانماں
جو سُناتا پھرتا تھا حسرت بھری آواز میں
غیر ملکوں میں تمھارے درد و غم کی داستاں

کیوں ہمارے باغ میں بیگانہ وش ہے اے صبا
آگیا پھر وہ اُمیدوں کے چمن کا باغباں
ہو کرم فرما ادھر بھی، کس طرف ہے اے بہار
چھ مہینے ہو گئے، اب دُور اے دَورِ خزاں
آگیا اے قوم، وہ کشتی کا کھیوا آگیا
کوئی دم میں پار ہے بیڑا ہمارا، اے جہاں
لاجپت رائے وہ تیرا تجھ کو واپس مل گیا
مانڈلے سے جھیل کر آیا ہے لاکھوں سختیاں
جاگ اے بھارت، ترے پہلو میں ہے پیارا ترا
سامنے آنکھوں کے ہے وہ آنکھ کا تارا ترا
جب کہ پہنچی ہند میں تیری رہائی کی خبر
قیدِ غم سے ہو گیا آزاد ہر فردِ بشر
ہو گئی وہ صبح، صبحِ عید ملکِ ہند میں
مژدۂ آمد ترا اے آئی جب بادِ سحر
کون لایا تجھ کو واپس ہند میں اے لاجپت
اپنی آہیں نارسا اور اپنے نالے بے اثر

پار ہے ساتوں سمندر کے وہ دربارِ شہی
قیصرِ کسریٰ عدالت جس میں ہے خود جلوہ گر
دُور ہے ہندوستاں سے کس قدر وہ بابِ داد
مار سکتا ہے وہاں بھارت کا پنچھی جا کے پر؟
جذبۂ اُلفت ہمارا کھینچ کر لایا تجھے
آہ! پہ آئی کہاں سے اس میں طاقت اس قدر
تیری معصومی تجھے لائی یہاں لے لاجپت
تجھ کو تیری بیگناہی نے چھڑایا سر بسر
حاش للّٰہ، تُو نہ تھا باغی، یہ سب تھا افترا
جُرمِ حُبِّ قوم کا بیشک تُو ملزم تھا مگر
حالی و قالی بہت ہیں یوں تو شیدائے وطن
شعرِ حالی صادق آیا ایک تیرے حال پر
"جورِ اخواں دیدن و در عشقِ اخواں زیستن
زخمِ پیکاں خوردن و در شوقِ پیکاں زیستن"
آسماں تھا جن دنوں ہندوستاں پر خشمگیں
بیدہ آسا کانپتی تھی کانگڑے کی سرزمیں

تھی جہاں بستی، وہاں شہرِ خموشاں بس گیا
ہو گئے مٹی ہیں مٹی کیا مکاں اور کیا مکیں
آہ! لاکھوں گلبدن جب ہو گئے پیس کر غبار
مسکنِ ماہی تلک پہنچے ہزاروں مہ جبیں
بچ گئے تھے جو بچارے، تھے وہ مُردوں سے بتر
آسماں کھینچے ہوئے سر پر کھڑا تھا تیغِ کیں
بھوک سے بیتاب کچھ، کچھ تو دہ ہائے خاک ہیں
کچھ مرے، کچھ نیم بسمل اور مرنے کے قریں
تجھ سے یہ حالت نہ اپنے ملک کی دیکھی گئی
ہو گیا تیار خدمت کے لئے ڈٹ کر وہیں
سچ کہا ہے کہنے والے[1] نے کہ پہلو میں ترے
دل کے دو پہلو ہیں، اک ہے موم کا، اک آہنیں
موم کے پہلو میں جب تیرِ غمِ اہلِ وطن
آ کے لگتا ہے تو ہو جاتا ہے تو اندوہگیں
دوسرا پہلو جو لوہے کا بنا ہے سخت ہے
سختیِ ایّام کا جس پر اثر ہوتا نہیں

[1] ڈاکٹر سر گوکل چند نارنگ ایم اے

لاجپت رائے تو بیشک آبرو ہے قوم کی
مدعا تو قوم کا ہے، آرزو ہے قوم کی

ملک پر نازل ہوا جب قحط سالی کا عذاب
اے خدا ہندوستاں پر پھر نہ آئے یہ عتاب

خاص کر تھا راجپوتانہ گرفتار بلا
خلق نکلی گھر سے ہو کر خستہ و زار و خراب

اس مصیبت پر بہائے اک جہاں نے اشک خوں
سنگدل کوئی نہ رویا گر تو بس وہ تھا سحاب

راجپوتوں کے دلارے، ہائے وہ نازوں پلے
مانگتے تھے بھیک لیکن صاف ملتا تھا جواب

پیتے تھے خون جگر پانی کے بدلے آہ آہ
کھاتے تھے روٹی کے ٹکڑے کے عوض پیچ و تاب

پائے عریاں ہیں وہ چھالے تن پہ وہ گرد سفر
مارے مارے پھرتے تھے بے آب و ناں بے خورد و خواب

تو نے ایسے میں غریبوں کو بچایا، لاجپت
تو ہی ان سر ماز دوں پر بن کے چمکا آفتاب

دل دیا ہے دردمند ایسا تجھے اللہ نے

روز اوّل جو کروڑوں میں ہوا تھا انتخاب

آج کل بھی قحط کا ہر چند خدشہ کم نہیں!

تو یہاں موجود ہے اے لاجپت کچھ غم نہیں

ہم نہ ہوں گے دہر میں او ہستیٔ ناپائدار

ورنہ گلزار وطن کی تجھ کو دکھلاتے بہار

نکہتِ گلہائے آزادی کی اُڑ اُڑ کر مہک

جائے گی ہندوستاں سے سُوئے چیں سُوئے تتار

آئے گی بادِ سحر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی!

بن سنور کر سیر کو جیسے کوئی نکلے نگار

سبزۂ بیگانہ سے اٹھ جائے گی بیگانگی!

ساحلِ جوئے چمن سے خوب ہوگا ہمکنار

سینۂ اہلِ چمن سے کینہ ہو جائے گا دُور

دل میں پھولوں کے نہ دیکھے گا کوئی ہر گز غبار

دخل کیوں ہوگا خزاں کا گلشنِ شاداب میں

جب کہ پہرے پر کھڑے ہو جائیں گے سرو و چنار

خوب ہی دکھلائے گی خاکِ وطن گُلریزیاں
خوں شہیدانِ وطن کا جب کہ ہوگا آشکار

یہ ہمارا عہد جب ہو جائے گا عہدِ کہن
گُل کھلائے گی نئے جب گردشِ لیل و نہار

ثبت ہوگا برگ و گُل پر لاجپت رائے کا نام
اور گائے گی پُرانے گیت گلشن میں ہزار

ہم[1] نہ ہوں گے، ہم نہ ہوں گے آہ اے چشمِ خیال
کچھ نظر آتی ہے تجھ کو گردشِ دوراں کی چال؟

[1] پوری نصف صدی ([illegible] میں)، بیت چکی ہے۔ اُس وقت واقعی اس نظم کے مصنف کو توقع نہ تھی کہ اُس کی حینِ حیات میں غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ لیکن جیسا کہ اس نظم کے اس بند سے ظاہر ہے، اُمید اپنی جھلکیاں دکھا رہی تھی۔

غزل

یہ قفس اور اس میں یوں افسردہ و ناشاد ہم
خانہ پرورد چمن ہیں آخر اے صیّاد ہم

پھر بہار آئی، ہوئے پھر مائلِ فریاد ہم
کرتے ہیں کنجِ قفس میں آشیاں کو یاد ہم

رشکِ جنّت فصلِ گُل میں ہیں فضائیں دہر کی
اور قفس میں مضطرب ہیں آشیاں برباد ہم

ہم صفیرانِ چمن سے جا کے کہنا اے صبا!
میہماں ہیں کوئی دم کے کُشتۂ بیداد ہم

یادِ نسرین و سمن سے دل میں لاکھوں داغ ہیں
مثلِ محرومِ حزیں غربت میں ہیں ناشاد ہم

ترانۂ مسرت

شکر صد شکر، ہو گئے آزاد — لاجپت رائے، جوہر[۱] و کچلو[۲]
ملک بھر میں یہ مژدہ پھیل گیا — جیسے فصلِ بہار میں خوشبو
دردمندانِ قوم ہیں دلشاد — عالمِ انبساط ہے ہر سُو
آ گئے پھر نسیم کے جھونکے — جا چکی فتنہ و فساد کی بُو
عوضِ خار زار دیکھیں گے — گل و ریحان و لالہ و شببُو
بُوم و زاغ و زغن کا دَور گیا — سنئے بُلبل کا نغمۂ دلجُو
رفع ہو جائیں گے نزاع تمام — اب رہے گی نہ مَیں مَیں و تُو تُو
وقت وہ آ گیا قریب کہ جب — گلے مل جائیں مُسلم و ہندو

پھر وہی جد و جہد ہو جاری
رکھ کے ہر اختلاف کو اک سُو

۱ مولانا محمد علی جوہر ۲ ڈاکٹر سیف الدین کچلو

ڈائر اور نادِر

دونوں کے قتلِ عام کا مقابلہ

نادر کا قتلِ عام ہے مشہور آج تک
سفّاک اُس کا نام ہے مشہور آج تک
ہے آج تک وہ سانحہ غارت گرِ سکوں
تاریخِ ملکِ ہند بہاتی ہے اشکِ خوں
لیکن ہے جورِ نادرِ سفّاک سے سوا
ڈائر کے قتلِ عام کا پُر ہَول ماجرا

اُس نے کیا تھا قتل رعایائے غیر کو
جو ہو چکی تھی جنگ میں خود اُس کے رُوبرو
جس سے ذرا بھی اُس کو اُمیدِ وفا نہ تھی
جو قوم ابھی تھی زندہ، شہیدِ جفا نہ تھی!

ڈائر نے قتلِ عام کیا اُس مقام پر!
مرتے جہاں ہیں لوگ، اطاعت کے نام پر
جن کی وفا کے گیت ڈوائر نے گائے ہیں
برطانیہ کے کام بُرے وقت آئے ہیں
یورپ لہو سے جن کی ابھی لالہ زار ہے
اب تک ہوائے دشت میں جن کا غبار ہے

اُن کے ہی بھائی بند تھے اُس باغ میں جہاں
ساون کے بادلوں کی طرح برسیں گولیاں
شامل تھے اُن میں پیر بھی اور خورد سال بھی
دل میں کسی کے تھا نہ خطر کا خیال بھی
میلہ سمجھ کے باغ میں داخل ہوا کوئی
جگمٹ عجیب جان کے شامل ہوا کوئی
نکلا تھا کوئی لُوٹنے لطفِ بہار کو
آغوش میں لئے تھا کوئی شیر خوار کو

تھی درمیانِ باغ ہزاروں کی بھیڑ بھاڑ
ناگاہ اک طرف سے چلی گولیوں کی باڑ
پھر وہ ہوا کہ جس سے لرزتی ہے تن میں جاں
پتھر کا دل بناؤں تو کچھ ہو سکے بیاں
ڈائر کے قتلِ عام نے خونِ وفا کیا
لوہو سے لال دامنِ برطانیا کیا

غزل

تیرا خوں ہونا دلِ حسرت نشاں دیکھا کئے
منظرِ خونیں بچشمِ خوں فشاں دیکھا کئے

دودِ آہِ دردمندانِ وطن سے ہر سحر
آسماں اک اور زیرِ آسماں دیکھا کئے

اُس سے رُو گرداں رہی تُو اور یونہی اہلِ چمن
راہ تیری لے بہارِ بے خزاں دیکھا کئے

نغمہ آرائی سے کیا ہم کو کہ فصلِ گُل میں بھی
بجلیوں کی زد میں شاخِ آشیاں دیکھا کئے

اِس جہاں میں شادؔ اے محروم کیا ہوتے کہ ہم
عُمر بھر بربادیِ ہندوستاں دیکھا کئے

مناظرہ

شیخ سعدیؒ اور اوڈوائر

اوڈوائر سے یہ سعدیؒ نے کہا — کشورِ پنجاب کے فرماں روا
دل میں کچھ اپنے خدا کا خوف کر — اس قدر زعمِ حکومت میں نہ آ
بے خطاؤں پر نہ ڈھا جور و ستم! — رکھ روا ان پر نہ جورِ ناروا
گر نہیں خوفِ خدا کا کچھ اثر — (نام کو ہے ان دلوں خوفِ خدا)
کب کرے گا صاد ان اعمال پر — تاجدارِ کشورِ برطانیا
ذبح کر ان کو نہ باغی جان کر — باوفا ہیں، باوفا ہیں، باوفا!
نامِ شاہنشاہ پر مرتے ہیں یہ — جنگِ یورپ نے یہ ثابت کر دیا
ان سے بڑھ کر باوفا کوئی نہیں — تو نے جلسوں میں کہا ہے بارہا
بم کے گولوں کے عوض پنجاب میں — چاہیئے آنسو ندامت کے گرا
"تا قیامت بس وہ کافی ہے تجھے — جلیانوالے میں جو کچھ تو نے کیا

مائل لطف و کرم حاکم رہے
حکمرانی کا اسی میں ہے مزا

سلطنت کے قصرِ عالی شان کی
چاہیئے عدل و نکوئی پر بِنا

کیا گلستاں میں نظر آیا نہیں
حق میں ظالم کے جو کچھ میں نے کہا

"ظالمے را خفتہ دیدم نیم روز
گفتم ایں فتنہ است خوابش بُردہ بہ
آنکہ خوابش بہتر از بیداری است
آنچناں بد زندگانی مُردہ بہ"

اوڈوائر نے دیا فوراً جواب
ناصحِ شاہانِ پیشیں سعدیا!

کس طرح تو آگیا پنجاب میں
بند ہے یاں ناصحوں کا داخلہ

اینڈریوز اور مارٹن اہلِ فرنگ
تو یکے از ساکنانِ ایشیا

وہ تو ہوں پابند میرے حکم کے
تُو یہاں پھرتا رہے مثلِ ہوا

تجھ کو پاتا کاش قیدِ جسم میں
پھر نصیحت کا چکھا دیتا مزا

خیر تجھ سے بھی سمجھ لوں گا کبھی
عالمِ ارواح میں جب آؤں گا

جو ہوا پنجاب والوں سے سلوک
مستحق اس کے ہی تھے یہ نا سزا

ڈالتے تھے نیند میں میری خلل!
کرکے جلسوں میں بہت آہ و بکا

رہنما بیدار کرتے تھے انھیں
چاہتا تھا میں کہ سو جائیں ذرا

اُن کے ہی آرام کا طالب تھا میں
خواب بیداری سے ہے راحت فزا

حق طلب کرتے تھے یہ سرکار سے
چھاپ کر اخبارِ حق میں نے دیا

جنگِ یورپ میں جو تھے جا کر لڑے
اُن کو اسنادِ طلائی کیں عطا

سرفرازی ہے رعایا کی یہی
سر نہ ہو پائے حکومت سے جُدا

ورنہ بم ہے، توپ ہے، بندوق ہے
تیرے وقتوں میں بھی یہ ساماں تھے کیا

کرتے تھے تیری نصائح پر عمل
خسروانِ عہدِ پیشیں، سعدیا!

کوئی ساماں پاس وہ رکھتے نہ تھے
کارگر لطف و عنایت کے سوا

ورنہ کیا تاب و تواں محکوم میں
پیشِ حاکم کر سکے چون و چرا

دیکھ میں نے کر دیا ثابت اسے
جو کبھی تو نے گلستاں میں کہا

"ہر کہ با پولاد بازو پنجہ کرد
ساعدِ سیمینِ خود را رنجہ کرد"

پنجاب اور دہلی کے واقعات پر

شاعر کا فرض ہے اُسے دیکھے بچشمِ غور
دنیا میں اُس کے سامنے جو کچھ ہو رُونما
ہو کر اثر پذیر کرے نظم میں بیان
کچھ اس طرح کہ کھینچ دے تصویر با جلا
دل تھا اِسی خیال میں میرا کہ غیب سے
آئی بگوشِ ہوش یہ حسرت بھری صدا
جو واقعات دہلی و پنجاب میں ہوئے
محروم اُن پہ نظم نہ لکھ اشکِ خوں بہا!

صبحِ وطن

وہ تازگی، وہ جلوہ نمائی نہیں پہلی
طلعت میں تری روح فزائی نہیں پہلی
زیبائی نہیں، ہوشِ رُبائی نہیں پہلی
اے صبحِ وطن تجھ میں صفائی نہیں پہلی

حیرت کے سبب آئینہ سیما ہے تو کیا ہے
آلودۂ گردِ غمِ دل تیری فضا ہے

خورشید یہ داغِ دلِ سوزاں کا ہے دھوکا
یا شعلۂ آہِ شرر افشاں کا ہے دھوکا
یا شمعِ سرِ گورِ غریباں کا ہے دھوکا
یا اخگرِ سوزِ غمِ پنہاں کا ہے دھوکا

شبنم پہ تری اشکِ چکیدہ کا گماں ہے
یہ گنبدِ نیلی ہے کہ آہوں کا دُھواں ہے؟

سُرخیِ شفق ہے کہ تمنّاؤں کا خوں ہے
یا وقفِ نمائش یہ ترا داغِ جنوں ہے

ہر ایک پھریرا تری کرنوں کا نگوں ہے
نظارہ جو ہے مظہرِ احوالِ زبوں ہے
نغمے جو تھے نالے ہوئے مرغانِ سحر کے
جو پھول کھلے، زخم ہوئے تن پہ شجر کے

اے صبحِ وطن! کیوں نہ ہو تو یاس کی تصویر
غمدیدہ و افسردہ و رنجیدہ و دلگیر
احرارِ وطن سب ہیں تہِ خنجرِ تعزیر
زنداں سے گیا تا بہ فلک نالۂ زنجیر

یہ زردی ہے خود تیرے رُخِ زرد سے پیدا
وحشت ہے ترے چاکِ گریباں سے ہویدا
اے کاش کبھی ہند میں وہ دَور بھی آئے
جب صبحِ وطن جلوۂ جانانہ دکھائے

آزادیٔ ابنائے وطن رنگ جمائے
زنداں میں یہ جذبہ نہ سمائے، نہ سمائے
یارب! اثرے بخش دعائے سحرم را
مائل بہ کرم کُن دلِ اربابِ ستم را

شامِ وطن

محبّانِ وطن کے قید ہو جانے پر

کیا ہو گیا ایّامِ مسرّت کو الٰہی؟
شامِ طربِ ہند کدھر ہو گئی راہی
ہو جس سے عیاں تیرگیِ دورِ تباہی
اے شامِ وطن ایسی ہے کچھ تیری سیاہی
ہے باعثِ غم گیسوئے برہم کا نظارا
پیدا اثر ہی صورتِ بے غم کا نظارا

اے شامِ وطن تجھ پہ برستی ہے اُداسی
ہر سمت ہے چھائی ہوئی حسرت کی گھٹا سی
رہ رہ کے صدا آتی ہے کچھ آہ و بُکا سی
ٹھنڈی تری سانسیں ہیں کہ چلتی ہے ہوا سی

بدلی ہوئی کس درجہ ہے صورت تری افسوس
کیا ہو گئی وہ موہنی مورت تری افسوس
ہوتا ہے گماں مجھ کو یہ سُرخیِ شفق پر!
روتا ہے کوئی خوں ترے اندوہ و قلق پر
اک آگ سی جلتی نظر آتی ہے اُفق پر
یا خُون کی تحریر ہے گردوں کے ورق پر

رنج و الم و حسرت و افسوس و الم کا
طوفاں ہے تری محفلِ خاموش میں برپا
اے شامِ وطن کیوں نہ ہو تو پیکرِ حرماں
رونق تھی تری جن سے وہ لُٹ گئے ساماں
جن شمعوں سے روشن تھی کبھی تیری شبستاں
اب ان کو مقدّر نے دیا گوشۂ زنداں

اِس دور میں کیوں درخورِ محفل نہ رہیں وہ
زنداں ہی میں چل بجھ کے نہ رہ جائیں کہیں وہ

پھر ہند میں آئیں کبھی ایّامِ مسرّت
تمہیدِ شبِ قدر ہو ہر شامِ سعادت

اس دور میں ہے جو کہ نمک پاشِ جراحت
تسکینِ دلِ زار ہو پھر تیری ملاحت

اک صبح نسیمِ سحری یوں ہو پیامی
"لو ٹوٹ گیا حلقۂ زنجیرِ غلامی"!

تا کجا؟

یہ خود فراموشی کہ ہے مانندِ خودکشی
اے ساکنانِ خطّۂ پنجاب تا کجا؟
کیوں رہبرانِ قوم نے آخر لیا ہے جوگ
دل میں تمھارے ذوقِ خور و خواب تا کجا؟
زنداں میں خاک پر ہے سرِ افتخارِ قوم
سودائے خامِ بالشِ سنجاب تا کجا؟
عنّاب گوں ہے خاک ابھی جلیانوالے کی
اے بادہ کش یہ شغلِ مئے ناب تا کجا؟
حالِ تباہِ قوم کا چرچا ہوا ہے عام
آنسو بنیں گے گوہرِ نایاب تا کجا؟
انجام خود سکوں ہے ہر اک اضطراب کا
تسکیں کو روئے گا دلِ بے تاب تا کجا؟

نوجوانوں سے خطاب

نوجوانانِ کشورِ پنجاب ‏ ‏ ‏ ‏ نونہالانِ گلشنِ شاداب
ذلتِ مادرِ وطن پر تم ‏ ‏ ‏ ‏ چاہیے حیرت ہے، یوں رہو گم سُم
جوش آئے نہ خونِ غیرت میں ‏ ‏ ‏ ‏ بے حسی ہو رگِ حمیت میں
تم کو آخر یہ ہو گیا کیا ہے؟ ‏ ‏ ‏ ‏ آخر اس درد کی دوا کیا ہے!
مارشل لا کو بھول بیٹھے ہو؟ ‏ ‏ ‏ ‏ جھوٹے وعدوں پہ پھول بیٹھے ہو
کیا نہیں جورِ اوڈوائر[1] یاد؟ ‏ ‏ ‏ ‏ یا نہیں قتلِ عام ڈائر[2] یاد
جانسن[3] کے وہ پُرعتاب احکام ‏ ‏ ‏ ‏ اوبرائن[4] کی زشتیِ دشنام

بے حیائی سمتھ[5] کی یاد کرو
کیوں نہ کچھ اس کا انسداد کرو

---

[1] پنجاب کا سخت گیر لفٹننٹ گورنر ‏ ‏ [2] مشہور بدنام جنرل جس نے جلیانوالے با
[3] امرتسر میں مارشل لا کا حاکمِ اعلیٰ ‏ ‏ [4] اور [5] دو بدنام ڈپٹی کمشنر

خیر مقدم

(پنجاب میں اوڈوائر اور ڈائر کے کارناموں کے بعد)

بعدِ شبِ تار صبحِ خنداں
جس طرح اُفق پہ ہو نمایاں
یا بعدِ فسردگیِ سرما!
ہو فصلِ بہار جلوہ فرما
یا موسمِ پُر خروش کے بعد
طوفانِ بلا کے جوش کے بعد
عالم ہو سکوت کا فضا میں
تُندی نہ ہو نام کو ہوا میں
اس طرح ہوا ہے جلوہ افگن
پنجاب میں عہدِ میکلیگن

تازیانہ

سجا ہے تجھ کو سودا ہے اگر آرائشِ تن کا
خزاں جس میں نہ آئے، پھول ہے تو ایسے گلشن کا
رہا کر، ہاں رہا کر تو نگہباں اپنے جوبن کا
تباہی پر وطن کی دل ہو میلا تیرے دشمن کا

نہیں بجا اگر گاڑھے سے تیرے دل کو نفرت ہے
اُٹھا سکتی کہاں اس کو تری شانِ رعونت ہے

محبّانِ وطن بے خانماں ہیں تجھ کو کیا پروا
گرفتارِ بلائے ناگہاں ہیں تجھ کو کیا پروا
قفس میں بُلبلانِ نغمہ خواں ہیں تجھ کو کیا پڑا
ترے سرو و سمن وقفِ خزاں ہیں تجھ کو کیا پڑا

تجھے کیا گر شہیدِ خنجرِ بیداد ہے کوئی
تجھے افسوس کیوں آئے، اگر ناشاد ہے کوئی

مصیبت میں ہزاروں خانداں ہیں اور تو بے غم
ترے اہلِ وطن محوِ فغاں ہیں اور تو بے غم

وطن کے حال پر سب نوحہ خواں ہیں اور تُو بے غم
تزلزل میں زمین و آسماں ہیں، اور تُو بے غم

نکل کر گھر سے جائے تا درِ زنداں بلا تیری
ہو جوشِ نالۂ زنجیر سے گریاں بلا تیری

تجھے تن تن کے چلنا زیب دیتا ہے، یُونہی چل تُو!
ترے اہلِ وطن رینگیں، نہ رینگا پیٹ کے بل تُو

جہاں کو اپنی رعنائی دکھا، اور خوب کس بل تُو
ہُوا کیا جلیاں توالے ہیں؟ کہ ہو بے وجہ بے کل تُو

زبردستی جو چہروں سے نقاب اُلٹے گئے تو کیا
خزاں میں دفترِ گُل بے حساب اُلٹے گئے تو کیا

تجھے طوقِ غلامی سے جو عار آئے تو کیوں آئے
جو دل میں حسرتِ قومی وقار آئے تو کیوں آئے

سکونِ قلب میں گر انتشار آئے تو کیوں آئے
خیالِ گردشِ لیل و نہار آئے تو کیوں آئے

تجھے معلوم کیا، قومی حمیّت کس کو کہتے ہیں!
یہ غیرت مند کیا ہیں اور غیرت کس کو کہتے ہیں!

فغاں کیے جاؤ

عیاں اثر کبھی ہوگا، فغاں کیے جاؤ
فغاں میں دل کی تمنّا بیاں کیے جاؤ

صدائے نالہ سے اہلِ زمیں کو تڑپا دو
بپا تہلکہ تہِ آسماں کیے جاؤ

سنائے جاؤ زمانے کو غم بھری رُوداد
بزورِ شکوۂ دورِ زماں کیے جاؤ

اُٹھائے جاؤ، فلک سے جو آپڑے اُفتاد
اِسی میں سُود ہے، اپنا زیاں کیے جاؤ

قرار عرش پہ بھی ہو نہ رُوحِ ڈائر کو
بلند شعلۂ سوزِ نہاں کیے جاؤ

دعائیں دیتے چلو جانِ اوڈوائر کو
ستم جو ڈھائے ہیں اُس نے بیاں کیے جاؤ

یہی ہے شرطِ حمیّت کہ اپنے آپ کو تم
نثارِ خدمتِ ہندوستاں کیے جاؤ

خاکِ ہند

اے خاکِ پاکِ ہند! ہم اَوجِ فلک ہے تُو
اِس تیرگی پہ سُرمۂ چشمِ ملک ہے تُو
انوارِ معرفت کی دِکھاتی جھلک ہے تُو
یعنی امینِ رازِ ازل آج تک ہے تُو
گو عہدِ اوّلیں کی طرح اب نہیں ہے تُو
عالم میں پھر بھی کعبۂ جاپان وچیں ہے تُو
کچھ رازِ ہست ونیست کھُلا تو کھُلا یہیں
عقدے فنا بقا کے ہوئے آ کے وا یہیں
بیتابیٔ نہاں کی ہوئی ابتدا یہیں
تسکینِ رُوح کی ہوئی پیدا فضا یہیں
پہنچے یہیں کے خاک نشیں آسماں تلک!
پھینکا کمندِ فکرِ رسا آسماں تلک!

وادی جہاں تری ہے وہ ایمن حریم ہے
ہر کوہ پر حکایتِ طُور و کلیم ہے
ہر ذرّہ تیرا مظہرِ حُسنِ قدیم ہے
تُو جلوہ گاہِ رحمتِ ربِّ کریم ہے

آتی ہے آہ! تیری ہواؤں سے بُوئے خُلد!
ہو زندگی یہاں کی تو کیا آرزوئے خُلد!
پیدا ہے تیرے سبزہ و گُل سے بہارِ خُلد!
کرتے نہیں ہیں تیرے مکیں انتظارِ خُلد
لیل و نہارِ ہند ہیں لیل و نہارِ خُلد
طالب جو ہے ترا نہیں منّت گزارِ خُلد

ہر چند وہ سماں نہیں اور وہ نہیں ہے تُو
پھر بھی زمیں پہ رشکِ بہشتِ بریں ہے تُو!

دو گُل شگفتہ ہیں ترے گلشن میں عقل و عشق
کِھلتے ہیں اپنے قُدرتی جوبن میں عقل و عشق
رہتے ہیں مل کے ایک نشیمن میں عقل و عشق
پاتے ہیں پرورش ترے دامن میں عقل و عشق

صہبائے بے خودی بھی ہے، جوشِ عمل بھی ہے
ذوقِ عیاں بھی، خامشیٔ بے خلل بھی ہے
تہذیب تیری چشمِ جہاں میں سما گئی
تعلیم تیری جور و ستم کو مٹا گئی
تقلید تیری دہر کو جنّت بنا گئی
تا ساحلِ عرب تری ٹھنڈی ہوا گئی
ہر ذرّہ ہے ترا وہ ضیا بارِ فلسفہ
یونان تلک گئے ترے انوارِ فلسفہ
تو آج مٹ مٹا کے بھی ہے فخرِ روزگار
بس چل سکا نہ گردشِ دوراں کا زینہار
دورِ زماں سے مٹ نہیں سکتی تری بہار
ہر داغِ دل ہے پھول کی صورت میں آشکار
بدخواہ گو ہے صدیوں سے چرخِ کہن ترا
پھر بھی اُجڑ اُجڑ کے ہرا ہے چمن ترا

آگلے ہندو

بہت نیک دل تھے، بہت نیک خُو تھے جری تھے، بہادر تھے، پر صُلح جُو تھے
وطن کے لئے فخر تھے، آبرو تھے پئے گلشنِ ہند رنگ اور بُو تھے
گُلوں سے ہے جس طرح رونق چمن کی
یُونہی اُن کے دم سے تھی زینت وطن کی

وطن پر وہ تھے جاں فدا کرنے والے نہ تھے جاں کی پروا ذرا کرنے والے
نہ تھے جنگ میں ابتدا کرنے والے مگر بعد میں انتہا کرنے والے
کبھی اُن کو میدان سے ٹلتے نہ دیکھا
کہ پائے عزیمت پھسلتے نہ دیکھا

جو ہوتی تھی رن میں شرربار ہندی — توکرتی تھی دشمن کو فی النار ہندی
دکھاتی تھی محشر کے آثار ہندی — سُنا ہے کہ تھی سخت خونخوار ہندی

گئے مان یونان کے مستر دلوہا
نہ تھا تیغِ ہندی کا یوں مستر دلوہا

نہ رکھتے تھے وہ کین وپیکار باہم — نہ کاوش، نہ جھگڑا نہ تکرار باہم
ملے جب کبھی یار و اغیار باہم — رہا بھائیوں کی طرح پیار باہم

عدالت میں جانے سے نفرت تھی اُن کو
کہ اک دوسرے سے محبّت تھی اُن کو

عدالت میں وہ کس لئے بھاگے جاتے — بھلا کس لئے جھوٹے شاہد بناتے
وہ کیوں گالیاں اہلِ قانوں کی کھاتے — عبث کس لئے اپنی عزّت گنواتے

بنا دھرم پر اُن کے بیوہار کی تھی؛
ہر اک کام میں رہنما ستی تھی؛

اہنسا کے پابند، دھرماتما تھے — صداقت کے پُتلے تھے اور بے ریا تھے
بتاتی ہے دنیا کہ وہ لوگ کیا تھے — بظاہر بشر، اصل میں دیوتا تھے

اُنہی کی ہیں اے وائے اولاد ہم بھی
زمانے میں ہیں ننگِ اجداد ہم بھی

نہ تھے رند رسوا نہ میخوار تھے وہ   نہ عیّاش تھے وہ، نہ بیمار تھے وہ
نہ تھے چور رہزن، نہ بدکار تھے وہ   تھے نیکو روش، نیک اطوار تھے وہ

لگاتا نہ تھا قفل کوئی دروں کو
کھُلا چھوڑ جاتے تھے اپنے گھروں کو

جہاں میں تھا جس وقت دورِ غلامی   وہ آزادیِ ہر بشر کے تھے حامی
وہاں سرفرازی، یہاں نیک نامی   رہے دونوں عالم میں یعنی گرامی

بلندی وہ اُن کی، یہ پستی ہماری
نہ ہونے سے بدتر ہے ہستی ہماری

خموش مُقابلہ[1]

یہ نہیں ہے شانِ وفا صنم کہ کریں بجوش مقابلہ
تری سختیوں سے کریں گے ہم، بخدا! خموش مقابلہ
ترے پائمالِ ستم ہیں گو، مگر ان میں تاب و تواں یہ ہے
شب و روز کرتے ہیں، موت سے ترے سرفروش مقابلہ
تو جو خوں ہوا ہے تو کیا ہوا، کہ دمِ اخیر تلک کیا
غمِ بے حساب سے تو نے اے دلِ صبر کوش مقابلہ
جو ادا ہے تیغ بکف ہے وہ، جو سخن ہے خنجرِ جاں ستاں
تری فوجِ ناز سے تا کجا، کریں چشم و گوش مقابلہ
گئی جان حسرتِ دید میں، مگر اُف نہ آئی زبان پر   تلک[2] اس کو کہتے ہیں ضبطِ غم، یہ ہے بے خروش مقابلہ

[1] مدافعتِ مجہول کے زمانے میں کہی گئی [2] مصنّف کا تخلص (مخفف)

سائمن کمیشن

سائمن کمیشن کے ہندوستان آنے پر

ہے مشہور ہندوستاں کا نفاق
مرض ہو گیا ہے پرانا نفاق

اسی فکر میں مر گئے چارہ گر
ہے بیمار ویسے کا ویسا مگر

عجب لوگ ہیں اہلِ ہندوستاں
نہیں جانتے اپنا سود و زیاں

نہیں متفق یہ کسی بات پر
تُلے رہتے ہیں اختلافات پر

نہ لیڈر یہاں کے بہم متفق
نہ پبلک نہ اہلِ قلم متفق

کمیشن کے آنے پہ برپا ہے شور
دکھاتی ہے ہر پارٹی اپنا زور

کوئی کہہ رہا ہے کہ آ سائمن
کوئی چیختا ہے کہ جا سائمن

سنہ ۱۹۲۹ء

نوحۂ سی، آر، داس

عالم نہ پوچھیے دلِ حسرت اساس کا
پیکر ہے کلفت و غم و حرمان و یاس کا

وقفِ ہزار درد ہے پھر جانِ ناتواں
پھر دل کو سامنا ہے غمِ بے قیاس کا

لے کر رہے گا کشتیٔ صبر و قرار کو
طوفاں اُٹھا ہے آج وہ بیم و ہراس کا

ظالم کو لاگ جوہرِ مردانگی سے ہے
شکوہ ہے گردشِ فلکِ ناشناس کا

ڈوبا ہے آج کوکبِ اُمّیدِ حرّیت
ماتم بپا ہے ہند میں سی، آر، داس کا

وہ فخرِ ہند، نازشِ بنگال چل بسا
قوم و وطن کو چھوڑ کے بدحال چل بسا

محبوبِ جانِ قوم، محبِّ وطن گیا
ہندوستان تمام عزاخانہ بن گیا

سوزِ غمِ فراق ملا ہم کو، اور وہ!
سُوئے بہشت چھوڑ کے دار المحن گیا
بادِ بہار تازہ کرے گی چمن کو کیا
وہ پھول تھا جو نازشِ صحنِ چمن، گیا
آزاد تھا وہ مردِ جری اس قدر کہ ہائے
بے بس ہوا تو توڑ کے زندانِ تن گیا
جاں آگئی وطن کی لبوں پر مگر ترا
خالی نہ ایک وار بھی چرخِ کہن گیا
جس کے لیے فضائے وطن قید خانہ ہو
جز مرگ کیا رہائی کا اُس کی بہانہ ہو
خوشیاں مناؤ، عیش کرو دشمنانِ ہند
رُخصت ہوئی ہے داس کے ہمراہ جانِ ہند
مرنے سے اس کے پیکرِ بے جاں ہوا یہ ملک
سی، آر، داس تھا دل و جان و زبانِ ہند
جوش و خروشِ ولولۂ حُریت گیا
باقی کہاں ہے طاقت و تاب و توانِ ہند

تھا میرِ کارواں وہی اور راہبر وہی
اس کے بغیر جائے کدھر کاروانِ ہند
مارا ہے سارے ہند کو مارا نہیں اُسے
اے موت! تھا وہ چارۂ دردِ نہانِ ہند

یا رب عدم میں اُس کی ضرورت پڑی تھی کیا؟
پیدا وہاں بھی دو عملی ہو گئی تھی کیا؟

اے رہ نوردِ عالمِ بالا یہ کیا کیا؟
پستی سے قوم کو نہ نکالا، یہ کیا کیا؟
دو ایک حلقے طوقِ غلامی کے توڑ کر!
پھر اس پہ تو نے ہاتھ نہ ڈالا، یہ کیا کیا؟
تھا دوستوں کو تیری سواری کا انتظار
اُترا جنازہ زیرِ ہمالا، یہ کیا کیا!
درماندگی میں چھوڑ گیا بے کسوں کو تُو
اے سرفرازِ ہمّت والا، یہ کیا کیا!
ڈھارس بندھا بندھا کے غریبوں کی چل بسا
سنبھلا نہ آہ یے کے سنبھالا، یہ کیا کیا!

روپوش آخری جھلک اُمّید کی ہوئی!
چاروں طرف ہے یاس کی آندھی اُٹھی ہوئی

لرزاں تھے مدّعی تری جُرأت کے سامنے
خس تھے وہ موجِ بحرِ طبیعت کے سامنے

جیسے نوا ہو مہرِ منوّر کے روبرو
یوں حیلہ جُو تھے تیری صداقت کے سامنے

سینہ سپر ہوا نہ کوئی سرفروشِ قوم
تیری طرح ہر ایک مصیبت کے سامنے

کُہنہ فسوں طرازِ سیاست فرنگ کے
تھے طفل تیری فہم و فراست کے سامنے

دی کیا سمجھ خدا نے کہ ناز و نعم کو ہیچ
سمجھا تُو ملک و قوم کی خدمت کے سامنے

تڑپیں گے آہ! جب نہ سُنیں گے صدا تری
پُر ہوگی بزمِ حُبِّ وطن میں نہ جا تری

۱۹۲۵ء

اشکِ خوں

نوحۂ وفاتِ شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے

اپنی قسمت پر بہا دو اشکِ خوں اے اہلِ ہند
آج ٹوٹا بخیۂ زخمِ دروں اے اہلِ ہند

چارہ گر اپنے ہوئے جاتے ہیں سب پیوندِ خاک
آسماں ہے شاملِ بختِ زبوں اے اہلِ ہند

قوم میں تازہ ابھی تھا ماتمِ سی آر داس
تھی فضائے ملک اب تک نیلگوں اے اہلِ ہند

مادرِ ہندوستاں نے دل پہ کھایا اور زخم
وار کاری کر گیا پھر چرخِ دوں اے اہلِ ہند

مدتوں تڑپائے گا ہم بے کسوں کو آہ، آہ
لاجپت رائے کے دل کا یہ سکوں اے اہلِ ہند
سختیاں سہ سہ کے دورِ آسماں کی اگر گیا
قصرِ آزادی کا وہ سنگیں ستوں اے اہلِ ہند
دُور منزل، اور ہم آوارۂ دشتِ بلا!
اب کدھر کو جائیں گے بے رہنموں اے اہلِ ہند
شادؔ اگر چاہو کہ ہو رُوحِ شہیدِ حرّیت
جذبۂ ایثار کو کر دو فزوں اے اہلِ ہند
عقلِ دُور اندیش آزادی دلا سکتی نہیں
چاہیئے اس دشت میں جوشِ جنوں اے اہلِ ہند
بھینٹ آزادی کی کیسے کیسے رہبر ہو گئے
بارہا جاگے نصیبے اپنے اور پھر سو گئے
مٹ گئی آخر تلک اور گوکھلے کی یادگار
ہو گیا اہلِ وطن کی آرزوؤں کا فشار
چل دیا وہ آہ جس نے بزمِ حُبِّ قوم میں!
کشورِ پنجاب کا قائم رکھا عزّ و وقار

یورپ اور امریکہ میں تھی دھاک جس کے نام کی
تجھ پہ اے خاکِ وطن قرباں ہوا وہ نامدار
آہ وہ خدمتگذارِ قوم، وہ سردارِ قوم
جاں سپار و دردمند و دلنواز و دل فگار
لاجپت رائے ترا نعم البدل ممکن نہیں
دشمنِ ہندوستاں ہے گردشِ لیل و نہار
آہ! تیری موت پر جن کے جگر ٹکڑے ہوئے
اُن کو ڈھارس کون دے اے بیکسوں کے غمگسار؟
گوش بر آواز ہیں بیٹھے ہوئے تیرے رفیق
تیرے درشن کے لئے مضطر ہے چشم اشکبار
یاس کی تصویر ہیبت خیز ہے پیشِ نظر
مٹ مٹا کر رہ گئے اُمید کے نقش و نگار
ناؤ ہے منجدھار میں اور نا خدا کوئی نہیں
اب خدا کا آسرا ہے جو لگا دے اُس کو پار
اے کہ تیری ذات تھی شمعِ تمنائے وطن!
کچھ تسلی دے انھیں بیکل ہیں ابنائے وطن!

سو گیا تو آہ! اے شیرِ نیستانِ وطن
تھی تری اک اک گرج سرمایۂ شانِ وطن
دیکھ لیتی کامیاب اپنے ارادوں میں تجھے
منتظر اُس روز کی تھی چشمِ حیرانِ وطن
دل ترے پہلو میں دھڑکا، ہوگئی بیتاب قوم
جاں ترے قالب سے نکلی اور گئی جانِ وطن
تیرے مٹنے سے پتا منزل کا مٹ کر رہ گیا
اے نشانِ منزلِ خدمت گزارانِ وطن
آئے گی کیوں کر حرارت پھر تنِ افسردہ میں
کس سے پھر آئے گی رونق بزمِ ویرانِ وطن
کون ہوگا، جنگِ آزادی میں رہ کر پیش پیش
سر بکف تیری طرح اے مردِ میدانِ وطن
تیرے چھپنے سے اندھیری رات کا عالم ہوا
کون سی بدلی میں ہے اے ماہِ تابانِ وطن
مانڈلے سے جس طرح آیا تھا، پھر اک بار آ
تاکہ ہو جائے بہاریں پھر گلستانِ وطن

پھر چمن کا پتہ پتہ تہنیت خوانی کرے
نحوِ استقبال ہوں پھر سرو و ریحانِ وطن
دشمنِ تاثیر ہے یہ نالۂ حسرت اثر
نوحہ خوانی، نوحہ خوانی اے دلِ غمدیدہ کر!
لالۂ خونیں جگر اپنا ہوا وقفِ خزاں!
منتظر تیرے رہے ہم اے بہارِ جاوداں
"اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کے گیت" (اقبال)
یہ ترانہ آہ! گوشِ باغباں پر ہے گراں
نغمۂ سازِ مسرت راس کیا آئے انھیں
جن غریبوں کے مقدر میں ہو فریاد و فغاں
خاک پر گرتا ہے تاجِ آبروئے ہند آج
اُٹھ گیا افسوس، ناموسِ وطن کا پاسباں
نام لیوا آرین تہذیب کا جاتا رہا
یادگارِ عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں
بیشۂ حُبِّ وطن کا شیرِ غرّاں مر گیا
باعثِ صد گونہ حسرت ہے خموشی کا سماں

لکھنے بیٹھے گر کوئی تیری جگر سوزی کا حال
یک بیک اُٹھے قلم سے اور کاغذ سے دھواں

کارنامے جس میں ہوں گے تیرے اے جانبازِ قوم
خونِ دل سے لکھی جائے گی وہ رنگیں داستاں

جو ہوا کرتا ہے انعامِ محبانِ وطن
تو نے پایا سب سے بڑھ چڑھ کر بوقتِ امتحاں

سختیاں اغیار کی، اپنوں کی بے پروائیاں
جیل خانے، ذلتیں، پابندیاں، رسوائیاں

مرنے والے! اب نہ ہوگی کچھ پریشانی تجھے
اب کوئی مجرم بنائے گا نہ زندانی تجھے

دیس سے اپنے نہ تجھ کو اب نکالے گا کوئی
دیکھنا ہوگا نہ داغِ خانہ ویرانی تجھے

اب بنا سکتا نہیں کوئی تجھے شاہی اسیر
کھینچنی ہوگی نہ اب زنجیرِ طولانی تجھے

اُڑ گیا تو توڑ کر اپنے قفس کی تیلیاں
کون پکڑے گا اب اے مرغِ گلستانی تجھے

لاٹھیوں سے اب تری تحقیر کر سکتا ہے کون
کون دے سکتا ہے اب طعنِ گراں جانی تجھے

کون ہے جو تجھ پہ اب پابندیاں عائد کرے
چھو نہیں سکتے قوانینِ جہانبانی تجھے

ساحلِ ہندوستاں کو اب نہ ترسے گی نظر
اب نہ دُکھ دے گا دیارِ غیر کا پانی تجھے

تیرے مرنے پر نہ خوش ہوں بدسگالانِ وطن
زعم میں اپنے سمجھ کر پیکرِ فانی تجھے

زندۂ جاوید تو، پائندۂ جاوید تو
لاجپت رائے مبارک ہو یہ قربانی تجھے

زندگانی تھی تری شمعِ فروزانِ وطن
موت ہو جائے گی تیری شعلۂ جانِ وطن

۱۹۲۸ء

بنامِ حسرت

اے عاشقِ آزادی، اے حسرتِ موہانی
اے پیکرِ بربادی، ناکامِ تن آسانی
اعزاز ترا ثابت زنداں کے گہن سے ہے
تو آج ہے بھارت میں رشکِ مہِ کنعانی
جاں بازِ وطن تجھ سا پیدا نہ ہوا ہوگا
جرأت پہ تری قرباں خود جذبۂ قربانی
یہ لعل، یہ رنگینی، اور اُس پہ یہ سنگینی
دل توڑ دیا تو نے اے ذوقِ ستم رانی
تاثیر دکھائے گی، بے سود نہ جائے گی
یہ تیری دل افگاری، یہ تیری تن افشانی
جو بزم کی زینت تھے، جو رزم کی شوکت تھے
بہتر تو نہ تھے اُن سے جو آج ہیں زندانی
اے اہلِ وطن سُننا، دل اور جگر تھامے
اُٹھتا ہے وہ زنداں سے پھر شورِ غزلخوانی

اکالی

آغاز میں

بزورِ اسلحہ جو کچھ کہ سکھوں نے کیا
وہ شانتی سے دلاورا کالیوں نے کیا

بھڑک اُٹھے نہ وہ ظالم کے تازیانوں سے
نہ مشتعل اُنھیں جاہل کی گالیوں نے کیا

جو زخم کھاتے ہیں، وہ سُرخ رُو ہیں صورتِ گُل
یہ باغِ دہر میں ثابت اکالیوں نے کیا

یہی دلیر تو گاندھی کا مُدّعا سمجھے
کہ سر کو راہِ محبّت میں نقشِ پا سمجھے

سمجھ میں اُن کے ارادے اسی کی آئیں گے
جو سر بکف ہو، فنا کو مگر بقا سمجھے

ہو گام زن وہی اِس راہِ خار پرور پر
جو انتہائے مصیبت کو ابتدا سمجھے

اے ہند کے مجنّو!

اے ہند کے مجنّو! اے رہبرانِ ملّت!

قائم جہاں میں تم سے ہے عزّ و شانِ ملّت

اُجڑے ہوئے چمن کے نخلِ اُمّید ہو تم

قربانیوں سے اپنی زندہ شہید ہو تم

بے سُود جائیں گی کیا قربانیاں تمھاری؟

ہوگی صدا بہ صحرا آہ و فغاں تمھاری؟

تڑپا کروگے یوں ہی سوزِ غمِ وطن سے؟

اہلِ وطن رہیں گے بے گانہ اس محن سے؟

زنداں میں تم رہو گے پابستہ سلاسل؟
اہلِ وطن رہیں گے عیش و خوشی پہ مائل؟
تم ہو گے چھوٹے چھوٹے دوزخ نما گھروں میں؟
اہلِ وطن کی راتیں ہوں گی تھیٹروں میں؟
دل، اُف، یُونہی تمھارے جل کر کباب ہوں گے؟
اُن کے لیے جو ہر دم مستِ شراب ہوں گے؟
ہوں گے نصیب تم کو داغوں پہ داغ یُوں ہی؟
زنداں سے ہوگی باہر بزمِ فراغ یُوں ہی؟
ملبُوس قاتلوں کا تم کو ملا کرے گا؟
اہلِ وطن کے تن پر ریشم سجا کرے گا؟
رہ جاؤ گے یُونہی تم پی پی کے خون جگر کا؟
ایذا ہی کیا ثمر ہے ایثار کے شجر کا؟
کس کے لیے ہے؟ کیوں ہے، یہ پیچ و تاب آخر؟
اہلِ وطن! ہے کچھ تو اس کا جواب آخر

زندانیوں کی عید

(تحریکِ خلافت کے دوران میں کہی گئی)

دیکھ کر تجھ کو اے ہلالِ عید
عید زِندانیوں کی یاد آئی

عید کیوں کر منائیں گے آخر
وہ اسیرانِ کنجِ تنہائی

اشکِ خونیں میں جلوہ گر ہوگا
رنگِ اظہارِ ناشکیبائی

یا کریں گے لبانِ مرغِ اسیر
درِ زنداں سے نالہ آرائی

یا پکاریں گے جوشِ وحشت میں
اے صبا گھر سے کیا خبر لائی

یا گزاریں گے سینہ کوبی میں
ساعتِ صبحِ عیدِ تنہائی

ہوں گے یا عالمِ تصوّر میں
سحرِ عید کے تماشائی

تال پر بیڑیوں کی ناچیں گے
کھو کے ہوش اور بن کے سودائی

اے دلِ شاعرِ ملال نصیب — یہ تخیّل ہے بادپیمائی
اے اسیرِ سلاسلِ اوہام — دیکھ لی ہم نے تیری دانائی
گرم بالُو سے ڈر کے کرتا ہے — قیس کو منعِ گام فرسائی
دردسے بھی کبھی تڑپتے ہیں — بے نیازانِ چارہ فرمائی
عشق کو موت سے ڈراتا ہے — کیا کبھی موت عشق کو آئی
ہے یہ الزام ان دلیروں پر — جن کے تیور سے موت شرمائی
رہروانِ رہِ رضا ہیں وہ — خوئے تسلیم کے ہیں شیدائی
سحر و شام اُن کا شیوہ ہے — شکرِ خالق میں ناصیہ سائی

سرفروشانِ ملک و ملّت سے
نہ رکھو اُمّیدِ ناشکیبائی

غم زدوں کی عید

(عید کے دن قیدی بیٹے کی ماں کے جذبات)

یہ نظم ایّامِ تحریکِ خلافت کی یادگار ہے

اے نورِ چشم! حافظ و ناصر خدا ترا
ہم منتظر رہے، تجھے زنداں میں آئی عید
تیرے لئے دعائیں تھیں، اور ذکر تھا ترا
سامانِ اشک و آہ سے ہم نے منائی عید
آ آ کے در سے تیرے احبّا پلٹ گئے
اِس غمکدے میں جب نظر اُن کو نہ آئی عید
رہ رہ کے تھی سکوت شکن بس یہی صدا
کیسی یہ تونے اب کے مُقدّر! دکھائی عید

افسردہ و ملول تھی وہ پیکرِ وفا
جس کے سہاگ میں تھی یہی ابتدائی عید
غمدیدگانِ ہجر کو تڑپا گئی ہے اور
اندوہ و رنج و حسرت و افسوس لائی عید
بیتاب کر رہا ہے مرے دل کو یہ خیال
زندانیوں نے کس طرح یارب منائی عید
احکامِ قید و بند بہت سخت ہیں وہاں
تیری ہوئی نہ ہوگی وہاں تک رسائی، عید
ہاں جادۂ رضا سے نہ اے دل ہو منحرف
غافلؔ ہے صبر و شکر تری انتہائی عید

انجامِ اتحاد

وعدے تھے اتحاد کے، دعوے خلوص کے
کیا ہو گیا وہ عہد، وہ پیماں کدھر گیا
حبِّ وطن کہ تھی "مِنَ الْاِیمان" وہ کیا ہوئی؟
وہ نقش دل سے کس طرح یک سر اُتر گیا؟
آتا نہیں ہے نعرۂ پُرجوش تا زبان
پہلو میں یک بہ یک دلِ شوریدہ مر گیا
آخر ہوا ہے دردِ وطن کا علاج کیا؟
جس سے تمام گریۂ شام و سحر گیا
حالت سے اپنی ہو گئے غافل ہم اس طرح
جادو کسی پہ کوئی ہو جس طرح کر گیا
کیا مطمئن ہیں اہلِ وطن، دیکھیے ذرا
گویا گلے سے طوقِ غلامی اُتر گیا
تسکینِ دل کو رہ گئی لے دے کے ایک بات
مُلتاں میں خیریت سے محرّم گزر گیا

۱۹۴۷ء

قافلے یوں بھی تلف ہوتے ہیں!

قید سے ہوں گے رہا جب سرفروشانِ وطن
یوں کہیں گے دیکھ کر حالِ پریشانِ وطن
"حیف ہم جن کے لئے محرومِ آزادی ہوئے
اپنے ہاتھوں سے وہ جاہل وقفِ بربادی ہوئے
جن کو چھوڑا ہم نے راہِ منزلِ مقصود پر!
ہو گئے افسوس وہ دشتِ بلا میں منتشر
قافلے یوں بھی تلف ہوتے ہیں منزل کے قریب
کشتیاں ہوتی ہیں یوں بھی غرق ساحل کے قریب
جن کی آزادی کی خاطر ہم ہوئے وقفِ بلا
مانگتے ہیں آج وہ اپنی غلامی کی دُعا
ہم گئے جن کو ہوا خواہِ اخوّت چھوڑ کر
آج وہ بیٹھے ہیں سب ملّت کے رشتے توڑ کر

محفلِ حُبِّ وطن میں کل جو تھے شیر و شکر!
آج ہیں اک دوسرے کے تشنۂ خوں سر بسر
اپنی زنجیروں کو کرتے ہیں کڑا، افسوس ہے
اُن کی نادانی پہ حیرت ہے، بڑا افسوس ہے
یہ نہیں ہرگز حصُولِ دَورِ آزادی کے طَور
بھائی بھائی کی لڑائی، خانہ بربادی کے طور
خانہ جنگی یا تو نیرنگِ فنا دکھلائے گی
یا غلامی کی بہت میعاد بڑھتی جائے گی
وقت ہے اپنے کیے پر اب بھی پچتائیں اگر
پھر سنبھل سکتے ہیں، دل میں کچھ بھی شرمائیں اگر

۱۹۲۴ء

انقلابِ آسماں

دیکھ اے دل! انقلابِ آسمانِ فتنہ گر!
شامِ غم سے ہے مبدّل صبحِ خندانِ وطن
منظرِ صبحِ وطن ہے، شاہدِ چاکِ جگر!
مظہرِ رنگِ مقدر شامِ حرمانِ وطن
جس طرح ماتم کناں کوئی ہو زلفیں کھول کر
ہو بہو ہے اس طرح حالِ پریشانِ وطن
پتا پتا ہو گیا اِس باغ کا وقفِ خزاں
ہو گئی آخر بہارِ سرو ریحانِ وطن

داغ اب جتنے دلِ اہلِ وطن میں ہیں، کبھی
پھول تھے اُتنے ہی تجھ میں اے گلستانِ وطن

یوں بھی دُنیا میں ہوا ہے کوئی سرتا سر اسیر
حلقۂ زنجیرِ غم ہے چشمِ حیرانِ وطن

زخم اک بھرنے نہیں پاتا کہ لگ جاتا ہے اور
وقفِ صد بیچارگی ہیں چارہ کارانِ وطن

یاد آیا ہے کہ تھا فخرِ جہاں ہندوستاں
باعثِ توقیرِ عالم جبکہ تھی شانِ وطن

داغ ہر اک دل میں ہے اس حسرتِ دیرینہ کا
پھر ہو روشن اے خدا! شمع شبستانِ وطن

پیامِ صُلحِ کُل

آہ پھر بزمِ وطن میں شورشِ بیہودہ ہے!
ہر مسرّت وقفِ غم، ہر عیش خوں آلودہ ہے
دشمنِ امن واماں ہے کس قدر بیجا خروش
فتنہ ہائے خفتہ کے حق میں ہے محشر زا خروش
بادۂ مہر و وفا کا قحط ہے اِس دَور میں
دُردِ کیں ہر جام میں ہے جائے مَے اِس دَور میں
یا خُمِ گردوں میں وہ دیرینہ مَے باقی نہیں!
یا کوئی خُم خانۂ اخلاص کا ساقی نہیں
وسعتِ مشرب کے بدلے تنگ ظرفی سے ہے کام
جام سے ٹکرا رہا ہے پَے بہ پَے محفل میں جام

نغمۂ صدق و صفا کی نَے سے اِن کو لاگ ہے
اپنی اپنی ڈفلی ہے اور اپنا اپنا راگ ہے
اتحاد اِن پر گراں ہے اور نفاق اِن کو عزیز
ایک مقصد ہے، مگر ہے افتراق اِن کو عزیز
جب کہیں تدبیر لڑتی ہے تو لڑ پڑتے ہیں یہ
جب ذرا تقدیر ملتی ہے، بگڑ پڑتے ہیں یہ
رنگ آخر لائیں گی اِن کی نفاق انگیزیاں
منتظر ہیں ذِلّتیں، بربادیاں، خُوں ریزیاں
کاش انھیں کر دے کوئی سرمستِ جامِ صلحِ کُل
لائے نانک کی طرح کوئی پیامِ صلحِ کُل

مُحِبّانِ وطن

اُونچی ہے بہت شانِ محبّانِ وطن کی
ہیں جانِ محبّانِ وطن شانِ وطن کی
تصویر کہیں حالِ پریشانِ وطن کی
تنویر کہیں شمعِ شبستانِ وطن کی
یوں عشقِ وطن میں ہوئے تصویر وطن کی
تقدیر جو اِن کی ہے سو تقدیر وطن کی

ایثار کے پُتلے ہیں، خلوص اِن کا ہے مذہب
راحت سے اِنھیں کام، نہ آرام سے مطلب
رُوپوش جو ظُلمت میں ہو اُمّید کا کوکب
یہ چیر کے رکھ دیتے ہیں اک سُو جگرِ شب
کر دیتے ہیں یوں مطلعِ انوار وطن کو
دکھلاتے ہیں اُمّید کے آثار وطن کو

انصاف و مساوات پہ آنچ آئے، یہ تڑپیں
معصوم کے دل کو کوئی تڑپائے، یہ تڑپیں
زر دار غریبوں پہ غضب ڈھائے، یہ تڑپیں
سینے پہ کوئی خنجرِ غم کھائے، یہ تڑپیں
ہے درد زمانے کا غرض اِن کے جگر میں
مضطر ہو کہیں کوئی، یہ بے چین ہیں گھر میں

حکّام کا ہر قہر و غضب اِن کے لئے ہے
آلام کی دنیا کا تعب اِن کے لئے ہے
موجود ہر اک نالۂ شب اِن کے لئے ہے
نابود مگر صبحِ طرب اِن کے لئے ہے
زنداں ہے کبھی اور کبھی دیس نکالا
شمشیر کہیں سر پہ، کہیں سینے پہ بھالا

دنیا کے زر و مال پہ یہ تُف نہیں کرتے
گھر بار جو لُٹ جائے تاسّف نہیں کرتے
جاں دینے میں ہرگز یہ توقّف نہیں کرتے
گردن بھی کٹا دیتے ہیں اور اُف نہیں کرتے

دل اِن کے ہیں دل اور جگر ہیں جگر اِن کے
سینے ہیں پئے تیغِ مصائب سپر اِن کے

فرحت دِہِ آفاق ہیں جوں نکہتِ برباد
ہیں فیضِ سبک رُوحی سے زنداں میں بھی آزاد

پابندِ قفس گرچہ ہوں مرغانِ چمن زاد
نغمے کا اثر رکھتی ہے رنگینیٔ فریاد

ہر چند تہِ خنجرِ بیداد ہوئی ہے
بُلبل کبھی منّت کشِ صیّاد ہوئی ہے؟

کہیئے جو انھیں ابرِ بہاراں تو بجا ہے
ملّت کا چمن اِن کے برسنے سے ہرا ہے

منزل یہ وہ ہے جس میں فنا عین بقا ہے
اس راہ میں مرنا جنھیں منظور ہوا ہے

نام اُن کے ہیں پائندہ دلِ اہلِ وطن میں
یوں رہتے ہیں وہ زندہ دلِ اہلِ وطن میں

مشرق کے آسماں پر

شاہ امان اللہ خاں والیٔ افغانستان کی یاد میں

صدیوں کے بعد آخر　چمکا تھا اک شرارا
روشن تریں ستارا　مشرق کے آسماں پر
اُمید کی شعاعیں　تھیں صاف آشکارا
جاں بخش اور دل آرا　مشرق کے آسماں پر
یُورش سے بادلوں کی　گھبرا کے وہ ستارا
گُم ہو گیا بچارا　مشرق کے آسماں پر

پھر اس کے دیکھنے کو   بیتاب ہے نظارا
پھرتا ہے مارا مارا   مشرق کے آسماں پر

چھائے ہوئے ہیں بادل   رنج والم کے بادل
جور وستم کے بادل   مشرق کے آسماں پر
رہنے نہ پائیں یارب   اس طرح جم کے بادل
مہماں ہوں دم کے بادل   مشرق کے آسماں پر
پھر ہو کے جلوہ آرا نکلے وہی ستارا
اُمّید کا سہارا، مشرق کے آسماں پر

دیکھ اے ہلالِ شام!

بھگت سنگھ کی پھانسی

دَورِ فلک نے ہم کو بنایا ہے گو غلام
آزادیاں ہیں وہ، نہ تجمّل، نہ احتشام
اُجڑی ہوئی اگرچہ ہے بزمِ وطن، مگر
چھلکا نہیں ابھی مئے حُبِّ وطن کا جام
دیکھ اے ہلالِ شام!
زنداں میں ہو رہا ہے وہ پھانسی کا اہتمام
پیدا سکوتِ مرگ کے آثار ہیں تمام
دروازے کال کوٹھڑیوں کے وہ کھُل گئے
نکلے ہیں اُن سے تین جوانانِ خوش خرام
دیکھ اے ہلالِ شام!

کھولے ہوئے ہے اپنا دہن دیوِ انتقام
جلاد کی نگاہ ہے شمشیرِ بے نیام
وہ بڑھ کے مرنے والوں نے نعرہ کیا بلند
جس سے لرز اُٹھے در و دیوار و سقف و بام
دیکھ اے ہلالِ شام!
یوں آ رہے ہیں جیسے ہو نوشاہ شاد کام
اہلِ وطن کو کرتے ہوئے آخری سلام
پھانسی کی رسّیوں کو دیا بوسہ شوق سے
چہرے ہیں رنگِ ذوقِ شہادت سے لالہ فام
دیکھ اے ہلالِ شام!
اب آگے کیا بتاؤں میں نازک ہے یہ مقام
اے سُننے والے اشک بہا اور جگر کو تھام
پھندے گلے میں ڈال کے تختے نکال کے
جلاد کر چکا ہے، جو کرنا تھا اُس کو کام
دیکھ اے ہلالِ شام!

نذرِ فنا ہوئیں وہ مچلتی جوانیاں!
تینوں کا ایک لحظہ میں قصہ ہوا تمام
ماتم کا شور ہند میں ہر سو بپا ہوا
تاروں نے آنکھوں آنکھوں میں دی اطلاعِ عام
گم ہے ہلالِ شام!
گنتا ہے عضو عضوِ شہیدانِ زیرِ دام
ہوتا ہے آہ اُن کے ٹھکانے کا اہتمام
رہنا گواہ بیاس کی موجو کہ کس طرح
لاشوں کے نیم سوختہ ٹکڑے ہوئے تمام
تُو بھی ہلالِ شام!

۱۹۳۱ء

ایک دوست کی گرفتاری پر

سنہ ۱۹۳۲ء میں دیوان منجو رام گاندھی (سابق وزیر مالیات صوبہ سرحد) میانوالی میں بسلسلۂ تحریکِ عدمِ تعاون گرفتار ہوکر سزایاب ہوئے۔ اس موقع پر یہ نظم موزوں ہوئی

تُجھے زنداں میں دیکھا اور دلِ غمدیدہ بھر آیا
جگر کا خُوں اُبل کر تا سرِ مژگانِ تر آیا

میانوالی کی گرمی اور مئی کے آخری دن ہیں
ہواؤں کو سِکھاتے آگ برسانا یہی دن ہیں

ہوا صحرا سے آتی ہے سمُومِ جاں گزا ہوکر
جو رُک جائے، فضا رہ جاتی ہے دامِ بلا ہوکر

کوئی پروردۂ آغوشِ زیبائے تنِ آسانی!
غضب ہے، ایسے موسم میں اگر ہو جائے زندانی!

وطن کے پیار کو ترجیح دے کر عیش و عشرت پر
کڑی تو نے اُٹھائی، آفریں ہے تیری ہمّت پر

بلا سے اپنی راحت اور اپنے چین کو کھویا
میانوالی میں تو نے حرّیت کا بیج تو بویا
یہ تخمِ حرّیت پھوٹے گا اک دن اور شجر ہوگا
خدا کے فضل سے پروان چڑھ کر بارور ہوگا
یہی منظور ہے شاید رضائے پاکِ یزداں کو
ہمارے بہتریں انساں کریں آباد زنداں کو
پکارے جائیں قیدی مجرموں میں ہوشیار اُن کا
بڑھے مانندِ یوسف بن کے زندانی وقار اُن کا
رہے گی اے وطن آخر تری حالت زبوں کب تک
بہائیں گے تری حالت پہ بیکس اشکِ خوں کب تک
نظر آئے گا کب تک ہر طرف منظر غلامی کا
رہے گا داغ کب تک تیرے ماتھے پر غلامی کا
رہے گی تا بہ کے دار و رسن کی گرم بازاری
رہیں حلقۂ زنجیر کب تک ہو گی خودداری
دُعا اے خالقِ ارض و سما سُن خستہ جانوں کی
تری رحمت سے حل ہو جائے مشکل ناتوانوں کی

ہری کشن کے پھول

ہری کشن ضلع ہزارہ کا ایک محبِ وطن نوجوان لاہور میں زیرِ تعلیم تھا۔ سنہ ۱۹۳۱ء کے کانووکیشن میں یونیورسٹی ہال میں اُس نے گورنر پنجاب پر گولی چلائی گورنر تو بچ گیا، لیکن ہری کشن کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ اور میانوالی میں ایک صبح اُس کی لاش کو بہت دُور ویرانے میں لے جا کر "سرکاری طور پر" جلا دیا گیا۔ اُدھر جانے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔ اتفاق سے فقیر بھی اسی روز میانوالی میں تھا۔ تمام شہر کی فضا ماتمی نظر آتی تھی۔ یہ اشعار وہیں موزوں ہوئے۔

وہ فضائے دشت میں پھر کسی کی چتا کے شعلے بلند ہیں
نہ پہنچ سکا کوئی تفتہ دل کہ تمام راستے بند ہیں
نہ صدائے نالۂ غم وہاں، نہ نشانِ سوزِ جگر وہاں
نہ قریب ہے کوئی آشنا، نہ ہے اقربا کا گزر وہاں
سرِ دشت آہ! دمِ سحر یہ اکیلی جلتی ہوئی چتا
نہ تو الوداع کہی گئی، نہ برائے دید کفن کھلا

نہیں ماتمی کوئی جُز سحر کہ ہے سینہ چاک بھی، زرد بھی!
اسی غم سے لب پہ ہے بار بار نسیم سے دمِ سرد بھی!
نہیں اب وہ شعلوں کی سرکشی، وہ فروغ اب نہیں آگ میں
کہ ذرا سی دیر میں جل بُجھا وہ شباب، اُس کی وہ حسرتیں
یہ نتیجہ سوزِ وطن کا ہے، یہ وطن کے درد کا ہے صِلا!
کئی نوجوان اسے پائیں گے، کئی نوجوانوں کو مِل چکا!
انھیں پائمال نہ کر صبا، کہ ہری کرشن کے یہ پھول ہیں
جو وطن کی آن پہ مر مٹا اُسی بے وطن کے یہ پھول ہیں!

پیامِ حرّیت

یہ جو شورِ ماتمِ داس[1] ہے بہ سبیلِ شیوۂ عام ہے
یہی موت ورنہ ہے زندگی، یہی شئے حیاتِ دوام ہے
وہ زباں سے اپنی سُنا گیا، وہ عمل سے اپنے دِکھا گیا
کہ وفا پرستِ وطن ہے جو خور و خواب اس پہ حرام ہے
وہ شباب جس کو ہے یہ الم کہ وطن ہے وقفِ ہزار غم
نہ حریفِ شاہد و نغمہ ہے، نہ حریصِ بادہ و جام ہے
اسی کش مکش میں جو مر گیا، وہی دامِ غم سے رہا ہوا
جو نہ پھڑپھڑائے تو کیا کرے وہ پرند جو تہِ دام ہے
یہ ہیں مکر و حیلہ کے سلسلے، انھیں داس جیسے ہیں توڑتے
نہ کوئی ہے وارثِ صاحبی، نہ کوئی کسی کا غلام ہے
یہ وطن کا روزِ سیاہ بھی نہ رہے گا دورِ زمانہ میں
نہ ہمیشہ جلوۂ صبح ہے نہ ہمیشہ پرتوِ شام ہے
تلک[2] حزیں نے جو کچھ کہا، نہیں شاعرانہ مبالغہ
سُنو اس کو اہلِ وطن ذرا کہ یہ حُرّیت کا پیام ہے

[1] جتیندر ناتھ داس جس نے بھوک ہڑتال کرکے ۱۹۳۱ء میں جان دی
[2] تلک مصنف کے نام کا مخفف ہے۔

مِٹ جائے گا

پنجاب کے ایک اخبار نے لکھا تھا "ایک دن ہندوستان مِٹ جائے گا"
اس کے جواب میں یہ شعر کہے گئے۔

تو بھی مِٹ جائے گا، جب ہندوستاں مِٹ جائے گا
اِس کے مٹنے سے ترا نام و نشاں مِٹ جائے گا
جس میں تُو اور تیری فطرت کے ہوں غدارِ وطن!
قوم وہ مِٹ جائے گی، وہ خانداں مِٹ جائے گا!
واہ، اے ناعاقبت اندیش، مرغِ بے وفا
تُو بہت خوش ہے کہ تیرا آشیاں مِٹ جائے گا
یوں تو ہر اک چیز فانی ہے، مگر پیش از قضا!
جو وطن دشمن ہے وہ ننگِ جہاں مِٹ جائے گا

ایشیا اور یورپ

درحقیقت ہے یہ خونِ آرزوئے ایشیا
جامِ یورپ میں جو رخشاں ہے مئے عنّابِ رنگ
رنگِ روئے ایشیائی اُڑ کے جا پہنچا وہاں
اِس قدر رنگیں نہ تھا پہلے خیابانِ فرنگ
لگ نہیں سکتا کنارے اہلِ مغرب کا جہاز
اہلِ مشرق ہوں نہ جب تک طعمۂ کامِ نہنگ
ایشیا میں آ کے بن جاتے ہیں لعلِ بے بہا
ساحلِ یورپ کے کنکر بے حقیقت لختِ سنگ

روزِ ہیجا مشرقی کے واسطے ہے کشت و خوں

مغربی ہے اور بزم عہد و پیماں بعدِ جنگ

بزمِ مغرب میں جو یہ جوشِ شراب و نغمہ ہے

اشک و آہِ ایشیا ہے اُس حریفِ جام و چنگ

گھونٹ دیتے ہیں گلا اس کا کسی تدبیر سے

ہوتی ہے مشرق کے دل میں جب کوئی پیدا اُمنگ

جب یہ حالت ہو تو مشرق کیوں نہ اب بیدار ہو

بے توقف، بے تحاشا، بے تامل، بے درنگ!

غدّارِ وطن!

ہو کے ہندی جو ہے تُو اپنے وطن کا دشمن
رُوح غدّار کی تیرے تنِ ناپاک میں ہے
وہ شرر جس سے دلِ اہلِ وفا ہے روشن
وائے افسوس، کہ افسردہ تری خاک میں ہے
جاں سپارانِ وطن دیتے ہیں جانیں جس پر
فہم میں ہے ترے وہ بات نہ ادراک میں ہے
محفلِ عیش میں تُو مستِ مئے بے فکری
زلزلہ آہِ ستم دیدہ سے افلاک میں ہے
انقلابات کی اک سیل چلی آتی ہے
تُو ہے غافل، تری تقدیر تری تاک میں ہے
یہ وہ طوفانِ بلا ہے کہ نہیں ٹل سکتا
دیکھ لے گا کہ تو شاملِ خس و خاشاک میں ہے

چھوت چھات

او بدنصیب بھارت، پھوٹے نصیب تیرے
شفقت سے آہ تیری ہیں دُور تیرے بچّے
محروم جن کو رکھّا انسانیت کے حق سے
جن کو ذلیل سمجھا، تحقیق ساتھ اُن کے
آخر میں سب کو یکساں ذلّت نصیب ہوگی
یہ چھُوت چھات کیسی تو نے روا رکھی ہے
ناراض تجھ سے تیرا اخلاقِ زندگی ہے
پاکیزگی پہ اپنی یہ نازِ ابلہی ہے
جو پاک ساز تجھ میں ہے اُن میں بھی وہی ہے
ہرگز تجھے نہ یُوں تو عزّت نصیب ہوگی

پہلو میں اُن کے دل ہے اور دلنواز دل میں
رکھتے ہیں ساتھ اس کے عجز و نیاز دل میں
تو وہ کہ بھر کے بیٹھا ہے کبر و ناز دل میں
یہ اُونچ نیچ کا ہے جو امتیاز دل میں
اس سے کبھی نہ تجھ کو رفعت نصیب ہوگی

مخدوم تو ہے اُن کا خدمت گزار ہیں وہ
جاں اور دل اپنے تجھ پر کرتے نثار ہیں وہ
وہ تیرے بارکش ہیں، کب تجھ پہ بار ہیں وہ
پھر کیوں ذلیل ہیں وہ، کیوں بے وقار ہیں وہ
اُن کے بغیر تجھ کو راحت نصیب ہوگی؟

جب محترز نہیں ہے اُن سے خدائے برتر
چلتا ہے کس لئے تو سائے سے اُن کے بچ کر
بخشے ہیں اُن کو اُس نے انسانیت کے جوہر
قیمت میں کم نہیں ہے گر خاک میں ہے گوہر
جوہر سے اپنے اس کو قیمت نصیب ہوگی

مثنوی

تصویرِ غلامی

ہے مصدرِ صد گناہ غلامی — جس سے ہو ذلیل ہر گرامی

افراد ہیں بے وقار اس سے — اقوام ذلیل و خوار اس سے

مجبوری و بے کسی یہی ہے — بے چارگی بندگی یہی ہے

شیروں کو کیا ہے اس نے روباہ — جو کوہِ گراں تھے، ہو گئے کاہ

انساں کو، یہ دشمنِ فضائل — کر دیتی ہے سخت بدخصائل

ناراستی و ریا و خِسّت — بغض و حسد و فریب و غیبت

پستیِ خیال و فعل و ہمّت — غمّازی و سازش و دنائت

یہ عیب ہیں اس کے دست پرور — ان سے بھی بلکہ اور بد تر

گر شرم و حیا سے کام لیجے — ممکن نہیں، اُن کا نام لیجے
کھو دیتی ہے جوہرِ شرافت — بو دیتی ہے تخمِ نخلِ خست
ہو جاتا ہے دل پہ بڑھ کے قائم — خوفِ خالق سے رُعبِ حاکم
محکومِ بشر جہاں بشر ہے — نایاب تمیزِ خیر و شر ہے
انساں کے لئے رضائے انساں — کرواتی ہے کارہائے شیطاں
مر جاتے ہیں مدرکاتِ علوی — دب جاتی ہیں سب صفاتِ علوی
بالیدگیٔ قوائے فطرت — ممکن نہیں زیرِ بارِ وحشت
رہتے ہیں سُکڑ کے ہوش و فرہنگ — روئیدگی جس طرح تہِ سنگ
گر بیٹھتی ہے سرشتِ آزاد — اوصاف تمام اپنے برباد
رُوح و تن و جاں بحالِ ابتر — رہ جاتے ہیں سر بسر سمٹ کر

ہوں غیر کفیلِ حاجتِ نفس
رہ سکتی نہیں ہے عزتِ نفس

شہباز کہ شاہِ طائراں ہے — قبضے میں فضائے آسماں ہے
رہ کر چندے بدامِ تسخیر — ہو جاتا ہے بدتر از عصافیر
گو خود ہے شکار مار لاتا — آقا کے ہاتھ سے ہے کھاتا

نادان طفیلِ رعبِ فائق

ہے مانتا اُس کو اپنا رازق

جنگل کا وہ فیلِ چرخ پیکر　　پربت کو ہلائے جس کی ٹکر
ہوتا ہے جب آدمی کے بس میں　　آزادی کی چھوڑتا ہے رسمیں
کرتا ہے خلافِ حکمِ فطرت　　مزدور کی طرح سب مشقت

کھاتا ہے مزے سے دال روٹی
کچی ہو، جلی ہو، خواہ موٹی

جنگل کا بادشاہ ہے شیر　　کر لیتا ہے جب اسے بشر زیر
بلی کی طرح وہ بن کے مسکین　　سرکس کے نباہتا ہے آئین

دب جاتی ہے دُم برعبِ قائد
کرتا ہے اشارے پر قواعد

انساں بھی یونہی غلام ہو کر　　رہ جاتا ہے جوہر اپنے کھو کر
گر جاتا ہے مرتبہ بشر کا　　دیتا ہے وہ کام گاؤ خر کا
ہر بات میں دوسرے کا محتاج　　کیوں کر رکھے اپنے نفس کی لاج
کرتی ہے اختراع و ایجاد　　باعزمِ بلند قومِ آزاد
باطبعِ فسردہ قومِ مجبور　　رہتی ہے علوِّ فن سے معذور

تخئیل دکھائے خاک پرواز
موجود ہو جب کمند انداز

حاکم بہ غرورِ حکم رانی — محکوم بہ فکرِ جاں فشانی
محکوم کو ہو نصیب خواری — حاکم کی ہے اس میں کامگاری
حاکم کا یہی ہے خاص مقصود — ہے اس کی متابعت میں بہبود
دم کوئی بھرے نہ خود سری کا — دعویٰ نہ کرے برابری کا
بڑھنے دے کسی کی کیوں وہ طاقت — کمزور پہ سہل ہے حکومت
ظاہر میں کیا کرے مدارات — نیت میں ہے اس کی ایک ہی بات
یعنی کہ سدا رہے یہ مغلوب! — ہر طور ہے اپنا غلبہ مطلوب
کرتا ہے کبھی نمائشِ فر — طاری ہو تا کہ رعب سب پر
تزویر کا پھینک کر کبھی دام — میٹھی باتوں سے کرتا ہے رام
محکوم سے کام گر ذرا سا — سرزد ہو خلافِ طبع والا
گردن زدنی ہے، کشتنی ہے — مفقود مجالِ دم زنی ہے
اچھا کوئی یا کوئی برا ہے — اک لاٹھی سے سب کو ہانکتا ہے

یکساں معتوب ہیں بد و نیک
دونوں کے لئے ہے ہتھکڑی ایک

لکھتے ہیں مورخین یوناں   اک بار بہ انقلاب دوراں
پیدا ہوئے تفرقوں کے آثار   ہونے لگی ابتری نمودار
آو ساطِ فرنگ سے نکل کر   اک قوم نے کر لیا مسخّر
یونان پہ بہ عہدِ پاستانی   صدیوں رہی اس کی حکمرانی
اس قوم کا یہ رہا وطیرہ   بازوئے شگفتہ، قلبِ تیرہ
میلے لگوا کے، دے کے انعام   اہلِ یوناں کو کر کے خوش کام
کھیلوں کے مقابلے کراتی   اور رنگ اکھاڑوں کے جماتی
چڑھتے نظر اس کی جتنے شہ زور   تحسین کا جنھیں بہت ملے شور
پہلے انھیں سرفراز کرتی   بخشش کے خزانے باز کرتی

پھر زہر سے، سازش اور فن سے

لے لیتی تھی جان اُن کے تن سے

جس قوم کی مرگ و زندگانی   جس قوم کا رنج و شادمانی
جس قوم کا ڈوبنا ابھرنا   اور جس کا بگڑنا یا سنورنا
جس قوم کی سب بُرائی نیکی   اور جس کا زوال اور ترقّی
صدیوں سے ہو زیرِ حکمِ اغیار   اس قوم کا حال کیوں نہ ہو زار

صدیوں سے غلام جو رہی ہو
حالت اس کی نہ کیوں ردی ہو

دنیا میں یہ حالتِ غلامی — یہ ذلت و یاس و تلخ کامی
سچ پوچھو تو قہرِ کبریا ہے — اعمالِ گزشتہ کی سزا ہے
میعاد گزر کے جب سزا کی — رحمت ہوتی ہے پھر خدا کی
غم کی شبِ تار ہے گزرتی — پھر صبحِ اُمید ہے نکھرتی
ہو جاتے ہیں قوم میں نمودار — مردانِ جری و صاحبِ ایثار
باغیرت و ہوشمند و اشرف — جاں باز، سرِ نیاز بر کف
کھوتے ہیں وہ اپنا چین آرام — لیتے ہیں وہ جد و جہد سے کام
زنداں میں ہیں کھینچتے سلاسل — ہو جاتے ہیں موت کے مقابل
القصہ وطن پہ ہو کے قرباں — ہیں ڈالتے قومِ مردہ میں جاں

ہو جاتی ہے پھر وہ قوم آزاد
یوں ہوتے ہیں غم نصیب پھر شاد

اپنا وطن

وسعتِ عالم میں اے خاکِ وطن، تیرے سوا
سرزمیں وہ کون سی ہے جس کو میں اپنا کہوں

تیری عزّت سے معزّز، تیری ذلت سے ذلیل
اپنی ہستی کو مرادف تیری ہستی کا کہوں

جلوہ گر اِن میں وہ فکرِ آسماں پیما ہوئی
وادیوں کو تیری رشکِ عالمِ بالا کہوں

رازِ امنِ دہر مضمر ہے اہنسا میں تری
کیوں نہ تجھ کو فخرِ دین و نازشِ دُنیا کہوں

بے رُخی تجھ کو دکھا کر، تجھ سے ہو کر بے نیاز
وہ جو رُوم و شام کے شیدا ہیں، اُن کو کیا کہوں

ہماری حالت

بہے جاتے ہیں یارانِ وطن سیلابِ مغرب میں
کہ سوجھی ہے نجات اپنی انھیں آدابِ مغرب میں
نہ تھی گویا کوئی تہذیب اپنی روئے عالم پر
کرم اپنا کیا ہے اہلِ مغرب نے بڑا ہم پر
سکھایا ہے ہمیں دنیا میں انساں کی طرح رہنا
مہذّب بن کے رہنا اور بہت اچھی طرح رہنا
نظر ظاہر پہ رکھنا بھول جانا اپنے باطن کو
چلانا شب کو گھر میں دَور، دفتر میں قلم دن کو

تماشاگاہ میں بیوی کو اور بچوں کو لے جانا
جو گانا سن کے آئیں، اُن سے سُننا اور خود گانا
سُرور آنکھوں میں آئے، لڑکیاں ناچیں جو مجلس میں
ترقی آرٹ کی ہے، کیا بُرائی ہے بھلا اس میں
سرود و رقص سے ہوتی ہے حاصل دل کو فرحت بھی
انہی اشغال سے قائم رہا کرتی ہے صحت بھی
تڑپ کر بھوک سے ہمسایہ مرتا ہے تو مرنے دو
کلب کو جاؤ تم، نیچر کو اپنا کام کرنے دو
غرض ہے عشرتِ امروز سے خوش ہیں اسے پاکر
نہیں پروا، وہ عزت سے ملے یا گالیاں کھاکر
حمیت مر چکی، لیکن کہیں ماتم نہیں اس کا
جنازہ اُٹھ گیا غیرت کا، لیکن غم نہیں اس کا

دارُوئے تلخ

تجھے او بابُوئے صاحب نما! آتی حیا بھی ہے؟
کوئی تیرا وطن بھی، کوئی ایماں بھی؟ خدا بھی ہے؟
یہ سودا آتا کجا سر میں ترے آرائشِ تن کا
تری خود بینی و نخوت کی آخر انتہا بھی ہے؟
تجھے، دنیا میں، او غافل! بجز شغلِ خود آرائی
کسی سے کچھ غرض بھی ہے، کسی سے واسطا بھی ہے؟
نہیں پہنچی صدا دردِ وطن کی تیرے کانوں تک
خلافت کے الم کا جس میں شامل ماجرا بھی ہے؟

اسیرانِ وطن کے حالِ ابتر سے نہیں واقف!
کہ اُن میں سے ہر اک مظلوم بھی ہے، بے خطا بھی ہے!
بزعمِ خویش اے ناداں! تو ہے محفوظ ساحل پر
کہ اپنی آپ کشتی بھی ہے، اپنا ناخدا بھی ہے!
مگر اے خود غرض! ہے جزوِ ملّت یہ تری ہستی
گئی ملّت، تو دل میں سوچ، پھر تیری بقا بھی ہے؟
لپکتی آ رہی ہیں جس کی موجیں تیری ملّت پر
نظر آخر تجھے آتا وہ طوفانِ بلا بھی ہے؟
نہیں نکٹائی میں پتلون و کالر میں تری عزّت
اُسی میں ہے تری عزّت، ہے جس میں قوم کی عزّت

پیامِ صُلحِ کُل

آہ اے میرے بدنصیب وطن　　　　تفرقوں نے تجھے کیا بدنام
کونسے مُلک میں نہیں ہے آج　　　　اختلافات کا ترے اعلام
نہ رہی اتفاق کی صورت　　　　مٹ گیا نقشِ اتحاد تمام
تجھ پہ روشن ہے یہ حقیقت بھی　　　　اس سے واقف ہیں تیرے خاص و عام
کہ غلامی سزا نفاق کی ہے　　　　اس میں ہرگز نہیں ہے جائے کلام
اور کہتے ہیں جس کو آزادی　　　　ہے فقط اتحاد کا انعام

علم و حکمت کی سرزمیں تجھ پر　　　　فتنہ و شر کا بچھ گیا ہے دام
تیری صبحِ اُمید کو ہم نے　　　　کر دیا تیرہ فام صورتِ شام

طاق پر رکھ دیئے صحیفے سب — مئے غفلت کا پی کے ہم نے جام
چھوڑ کر مسلکِ رواداری — اپنے خالق کے توڑ کر احکام
نہیں مٹنے میں اب کسر باقی — نظر آتا ہے ہند کا انجام

ہو رہا تھا یونہی پریشاں میں — رو رہا تھا یونہی دلِ ناکام
کہ صدا غیب سے سُنی میں نے — جس میں پنہاں تھا زیست کا پیغام
"ہندیو! اب بھی ہو سکو گے تم — بزمِ اقوام میں بلند مقام
صدق دل سے اگر ہو زیرِ عمل
گُرو نانک کا صُلحِ کُل پیغام"

پھول برساؤ

جن سرافرازوں کی رُوحیں آج ہیں افلاک پر
موت خود حیراں تھی جن کی جُرأتِ بے باک پر
نقش جن کے نام ہیں اب تک دلِ غمناک پر
رحمتِ ایزد ہو دائم اُن کی جانِ پاک پر
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

پھول برساؤ کہ پھولوں میں ہے خوشبوئے وفا
تھی سرشتِ پاک اُن کی عاشقِ خوئے وفا
موت پر اُن کی گئے جو روئے در روئے وفا
کیوں نہ ہوں اہل وطن کے اشکِ خوں جوئے وفا
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

پھول برساؤ کہ تھے اُن میں کئی ایسے جواں
نوجوانی جن کی تھی رشکِ بہارِ بوستاں
ہوگیا گلزارِ ہستی جن کا پامالِ خزاں
دے گئے لیکن وطن کو وہ بہارِ جاوداں
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

پھول برساؤ کہ تھے اُن میں کئی کم سن ابھی
تھے جہاں میں کھیلنے ہنسنے کے اُن کے دن ابھی
بے ریا، یکساں تھے اُن کے ظاہر و باطن ابھی
مر گئے بے نام، پائندہ ہیں وہ لیکن ابھی
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

تھے وہ فخرِ آدمیت، افتخارِ زندگی
تھے وہ انساں طرّۂ تاجِ وقارِ زندگی
اُن کے دم سے تھا چمن یہ خارزارِ زندگی
تھا نفس اُن کا نسیمِ نوبہارِ زندگی
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

چشمِ ظاہر بیں سمجھتی ہے کہ بس وہ مر گئے
درحقیقت موت کو فانی وہ ثابت کر گئے
جو وطن کے واسطے کٹوا کے اپنا سر گئے
خوں سے اپنے رنگ تصویرِ بقا میں بھر گئے
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

دیکھ لینا خونِ ناحق رنگ اک دن لائے گا
خود غرض ظالم کئے پر اپنے خود پچھتائے گا
راہ پر دورِ زماں آخر کبھی تو آئے گا
آسماں اس خاک کی تقدیر کو چمکائے گا
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر!

۱۹۳۲ء

آزادی ملنے کے بعد اس بند کا اضافہ ہوا۔

جن کی قید و بند نے دلوائی آزادی ہمیں! جن کی بربادی سے ہاتھ آئی ہے آبادی ہمیں
جن کے ماتم نے دیا ہے نغمۂ شادی ہمیں! دے کے اپنی جاں، جینے کی تمنّا دی ہمیں
پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر! (محروم)

بزرگانِ سلف اور ہم

بے جا ہے نازِ عظمتِ دیرینہ پر ہمیں
نخلِ کہن سے خاک ملے گا ثمر ہمیں

غافل وہ ہیں کہ اتنی نہیں ہے خبر ہمیں
اب کھینچ لے چلا ہے زمانہ کدھر ہمیں

قعرِ زمیں میں ہم ہیں، نظر آسماں پہ ہے
اور رفعتِ سلف کا فسانہ زباں پہ ہے

اب تک طلسمِ خوابِ شبینہ نظر میں ہے
اب تک گرانیِ مئے اسلاف سر میں ہے

خلقت تمام جاگ اٹھی دورِ سحر میں ہے
غافل پڑے ہیں ہم، شبِ تاریک گھر میں ہے

ہر چند اب نہ مے ہے نہ ساقی نہ جام ہے
سر میں بھرا مگر وہی سودائے خام ہے

آقا ہوئے بزرگ ہمارے، غلام ہم
وہ چشمۂ فیوض تھے اور تشنہ کام ہم

ممتاز وہ عمل سے تھے حُسنِ صفات سے
آلودہ ذات پات سے ہم چھُوت چھات سے

مانا کہ اُن میں تاجور و تاجدار تھے
لشکر کش و غنیم کُش و کامگار تھے
فخرِ زمانہ، نازشِ ملک و دیار تھے
دانائے رازِ گردشِ لیل و نہار تھے
اوصاف اُن کے آہ! تلف کر چکے ہیں ہم
تذلیلِ رفتگانِ سلف کر چکے ہیں ہم

اخلاق اُن کا اور نہ ایثار ہم میں ہے
باقی نہ اُن کی جراَتِ کردار ہم میں ہے
حق سے رہا جو اُن کو نہ وہ پیار ہم میں ہے
ذوقِ حیات سے جو ہے بیزار ہم میں ہے
ممکن ہے اُن کے نقشِ قدم پر اگر چلیں
گزرے گئے زمانہ میں کچھ کام کر چلیں

مقامِ پست[1]

محکوم زیردست، زبردست حکمراں
دائم اسی روش پہ ہے دنیا کا بندوبست
کمزور نارسا ہے مقامِ بلند تک
بے سود اُس کے واسطے ہے جدّوجہد جست
باطل ہیں دعویٰ ہائے مساوات سربسر
مشکل نہیں ہے عہدِ مساوات کی شکست
یہ کینیا کا فیصلہ کچھ آج کا نہیں!
کیوں سرنگوں ہیں شاستریِٔ وفا پرست
اپنے وطن میں جب نہ ہوئے سرفراز ہم
کیوں کر نہ مُلکِ غیر میں ملتا مقامِ پست!

[1] کینیا (جنوبی افریقہ) میں ۲۱ ہندوستانیوں کو جبراً پست علاقے میں بسانے کا حکم ہوا۔

نالۂ غم

مرے بدنصیب وطن! ترا ابھی دُور دورِ سعید ہے
شبِ تارِ یاس میں خیمہ زن، ابھی تیری صبحِ اُمید ہے
تہِ تیغِ جور تڑپ ابھی، اسی طرح اور تڑپ ابھی
کوئی زندگی ہے یہ زندگی کہ نہ زندہ ہے نہ شہید ہے
سرِ چرخ تیری عدوِ جاں، کئی بے قرار ہیں بجلیاں
ترے گھر سے شعلہ کہیں اُٹھا، یہ وہ فتنہ ہے کہ مزید ہے
ہوئی عام رسم عناد کی، کہ ہوا چلی ہے فساد کی
نہ وہ اختلاط کی مجلسیں نہ وہ لطفِ گفت و شنید ہے
وہ ہے سر پہ سایۂ شامِ غم کہ ہلالِ عید ہے تیغ دم
کبھی کہتے تھے اسے دیکھ کر، درِ میکدہ کی کلید ہے
یہ غضب ہے کیا تِلَکؔ حزیں ہوئی نالہ زار یہ سرزمیں
نہ کہیں نوائے اُمید ہے، نہ کہیں صدائے نوید ہے

ؔ تِلَک مصنف کے نام کا مخفف ہے

مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند

گاندھی کہ آج حسنِ عمل سے فرشتہ ہے
کہنے لگے ہیں اُس کو کئی بدسرشت، بد
وہ خیر خواہِ ہند ہے اور جاں نثارِ ہند
ہاں دشمنانِ ہند کو لازم ہے اس سے کد
گاندھی کے حق میں اس سے نکلتی ہیں گالیاں
جو دل کہ خود ہے سوختۂ آتشِ حسد
دیتے ہیں ورنہ ہندو و مسلم دعا اسے
کہتے ہیں اُس کو رہبرِ اعظم بہ شد و مد
اے منکرانِ عظمتِ ہندوستاں سنو
عیاریاں تمھاری ہیں فضلِ خدا سے رد

یہ بات اگرچہ رسمِ شرافت سے ہو بعید
ہم بے نقط سنائیں تمھیں اور بے عدد
تم جیسے بد زبانوں پہ صادق یہ قول ہے
"مہ نور می فشاند و سگ بانگ می زند"

قطعہ

گھبرا نہ مصیبت میں، نکلے گا قیامت میں
ارمان ترے دل کا، انصاف کے اے خواہاں
دنیا میں تو بس اتنا انصاف نظر آیا
ڈائر کے لیے پنشن، گاندھی کے لئے زنداں!

مہاتما گاندھی کے ایک برت پر

سُن کر مہاتما کا یہ عزمِ جاں سپاری
ہر دردمند دل پر اندوہ و غم ہے طاری
اپنے ہی دل پہ کھایا جس پیکرِ وفا نے
بھارت کے تن پہ آیا جب کوئی زخم کاری
انسانیت کی خدمت مسلک رہا ہے جس کا
کی جس نے نذرِ انساں عمرِ عزیز ساری
اُس کے اس امتحاں میں شاملِ کرم ہو تیرا
یہ التجا ہماری ہے تجھ سے ذاتِ باری
یہ ناخدا ہمارا ، یارب رہے سلامت
نکلی نہیں بھنور سے کشتی ابھی ہماری

قطعہ

اس میں کچھ شک نہیں کہ گاندھی ہے
دورِ حاضر میں بے نظیر انساں
حامیٔ شر اسے بتاتے ہیں
کئی ایسے بھی ہیں شریر انسان

گاندھی جی کا فیضِ عام

چھڑا لایا اسیرانِ وطن کو — مبارک ہے یہ تیرا کام گاندھی
دلِ ہندوستاں سے اٹھ رہی ہے — ترے حق میں دعائے عام گاندھی
تمنائیں ترے دل کی برآئیں — ترے دشمن رہیں ناکام گاندھی
ہوئے ممنونِ فیضِ عام ہم بھی — ہمیں بھی مل گیا انعام گاندھی

رہا ہو کر وطن میں اپنے آئے
فدائے ملک بھنجوں رام گاندھی[1]

شعر

اسیرانِ وطن کے رہا ہونے پر!

بہارِ جاں فزا آئی وطن کے گلستانوں میں — قفس خالی ہوئے اور رنگ جمے ہیں آشیانوں میں

---

[1] دیوان بھنجوں رام گاندھی مصنف کے دیرینہ دوستوں میں ہیں۔ میانوالی میں وکالت چھوڑ کر اور کانگریس کی عملی تحریک میں شامل ہو کر قید ہوئے۔

دُعا

مہاتما گاندھی کے ۲۱ روزہ برت پر

بگڑی ہوئی بنا دے اے بیکسوں کے والی!
کانٹوں کو پھول کر دے، صحرا کو باغ کر دے
بادِ فنا کی زد میں جو ٹمٹما رہا ہے
اپنے کرم سے روشن پھر وہ چراغ کر دے

فضل و کرم کا تیرے رکھتے ہیں اک سہارا
پوری امّید اپنی اے کارساز کر دے
درکار ہے وطن کو طولِ حیاتِ گاندھی
کم بھی اگر ہے باقی، اس کو دراز کر دے

باغِ وطن اُجڑ کر ویرانہ ہوگیا ہے
اس کی خزاں کو یا رب فصلِ بہار کر دے

منجدھار میں پھنسا ہے اُمید کا سفینہ
الطافِ بیکراں سے تُو اس کو پار کر دے

ترکِ غذا پہ گاندھی عامل ہے جن کی ضد سے
پیدا دلوں میں اُن کے تُو التفات کر دے
اس امتحاں میں پورا اُترے ترے کرم سے
پانی کو اس کے یارب آبِ حیات کر دے

دل کو ڈرا رہی ہیں پھر یاس کی گھٹائیں!
اُمید کی شعاعوں کو جلوہ ریز کر دے
اکیس[۲۱] دن کو یارب اکیس[۲۱] پل بنا دے
ارض و سما کی گردش کو اور تیز کر دے

رُباعی

انوارِ حیات کا ہے پیکر گاندھی
مثلِ خورشید جلوہ گستر گاندھی
بھارت میں رہے زندہ سلامت یارب
بھارت کی نجات کا سبب گاندھی

فرشتۂ رحمت

رحمت کے آہ! اگرچہ سزاوار ہم نہیں
گاندھی ہمیں فرشتۂ رحمت سے کم نہیں
اس بدنصیب ملک کا سرمایۂ وقار
شان و شکوہ لشکر و طبل و علم نہیں
فخرِ وطن یہ پیکرِ ایثارِ نفس ہے
کچھ بھی نہیں وطن میں اگر اس کا دم نہیں

گاندھی جی

ذرا جب اُٹھ کے قومی ولولوں نے کچھ ہوا باندھی
وہیں اُن کے دبانے کو دُھواں دھار اک اُٹھی آندھی
سلامت تیری کشتی کو خدا لے جائے ساحل تک
تری کوشش میں شامل ہے غریبوں کی دُعا گاندھی

آہ! موتی لال

آہ! اے نامدار موتی لال ۔۔۔ نازشِ روزگار، موتی لال
ماتمی ہے ترا جہاں سارا ۔۔۔ فخرِ شہر و دیار، موتی لال
لال تھا بدنصیب بھارت کا ۔۔۔ باعثِ افتخار موتی لال
تھا سرِ تاجِ آبروئے وطن ۔۔۔ گوہرِ شاہوار موتی لال
حکم اُس کا رواں دلوں پر تھا ۔۔۔ گو نہ تھا تاجدار موتی لال
باغِ حُبِّ وطن میں آیا تھا ۔۔۔ بن کے بادِ بہار موتی لال
جوگ تو نے لیا وطن کے لیے ۔۔۔ اے صداقت شعار موتی لال
زندگی تو نے اپنے ہاتھوں سے ۔۔۔ کی وطن پر نثار موتی لال
چل دیا، اور بدنصیبوں کو ۔۔۔ کر گیا اشکبار موتی لال

رہبرِ اعظمِ وطن نہ رہا
آہ! وہ عالمِ وطن نہ رہا

اے محبِّ وطن، فدائے وطن | درد میں تُو ہوا دوائے وطن
ہو سکا اور کس کی ہمت سے | تُو نے جو کچھ کیا برائے وطن
ہوئی نزدیک منزلِ مقصود | تُو ہوا جب سے رہنمائے وطن
تیری جرأت پہ ناز تھا اس کو | سرنگوں کیوں نہ ہو لوائے وطن
ہر نئے مرحلے پہ ماتم تو | آہ! اے بختِ نارسائے وطن
دیکھئے کب ہو دورِ عالم میں | ختم دورانِ ابتلائے وطن
تیرا جلوہ تھا اک شعاعِ امید | ہوگئی تیرہ پھر فضائے وطن
کہیں جنت میں تُو نہ ہو مضطر | کہ فلک رس ہیں نالہائے وطن
وہ جو ہے تیری یادگارِ عزیز | اُس کے حق میں ہے یہ دعائے وطن

کہ سلامت رہے جواہر لال
تا قیامت رہے جواہر لال

مقامِ عبرت

اپنی تقدیر کو پھر اہلِ وطن روتے ہیں
پھر جواہر کی اسیری پہ ہے برپا شیون

رات بھر نیند نہ آئی اسی بیتابی میں
لے گیا مجھ کو تصور سوئے آنند بھون

رونقِ بزمِ احبا تھا جہاں موتی لال!
وہ مکاں جس میں شگفتہ تھے لطیفوں کے چمن

جس میں رہتا تھا چہکا چوند کا عالم شب و روز
جلوہ افروز تھی اُمّید کی جاں بخش کرن

دیکھتا کیا ہوں کہ وہ محل ہے عبرت کا مقام
شبِ تاریک کا اوڑھے ہوئے تاریک کفن
اک ضعیفہ ہے وہاں نوحہ گرِ تنہائی
غمزدہ کاستہ جاں، خستہ دل و سوختہ تن
لب پہ آئی مرے رہ رہ کے یہ فریادِ حزیں
آہ! اے گردشِ ایامِ ستمگر، پُرفن
دیکھتے دیکھتے گلشن کو بیاباں کردے
اِس طرح قصرِ مسرّت کو بنا دے مدفن
وائے بر حالِ وطن، وائے بر احوالِ جہاں
یوں جگر سوز ہوا انجامِ محبّانِ وطن

ہندی نوجوان سے

محبّت کو، مسرّت کو، سرورِ شادمانی کو
تنعّم کو، تموّل کو، تعیّش کو، جوانی کو
وجاہت کو، امارت کو، وقارِ خاندانی کو
تن آسانی کی خواہش کو نشاطِ زندگانی کو
وطن پر کر دیا قرباں جواہر لال نہرو نے
جواہر لال نہرو بھی جواں ہے اور جواں تو بھی
جواں ہے اور اُمّیدِ مادرِ ہندوستاں تُو بھی
اسی اُجڑے چمن کا ایک ہے سروِ رواں تو بھی
جوانانِ چمن کے ساتھ ہے وقفِ خزاں تُو بھی
کہ سارے باغ کو جھلسا دیا ہے بس بھری لُو نے
تُو مسلم ہے کہ ہندو ہے، غرض اس سے نہیں مجھ کو
محبت ہے وطن سے تجھ کو اتنا ہے یقیں مجھ کو

تری حالت نہ ہو حسرت فزا، یاس آفریں مجھ کو
اگر مل جائے کچھ اس کا جوابِ دل نشیں مجھ کو
کیا ہے کیا وطن کے واسطے اے نوجواں تو نے؟
وطن جس کا ہو پابندِ الم وہ شادماں کیوں ہو
قفس ہو آشیاں جس کا وہ بلبل نغمہ خواں کیوں ہو
غلاموں کا وطن تیرا وطن اے نوجواں کیوں ہو
جہاں آزاد ہے ہندوستاں ننگِ جہاں کیوں ہو
مٹانے کی اسے کیا ٹھان لی چرخِ جفا جو نے؟
حمیّت کا تقاضا ہے کہ ہو کچھ انسداد اس کا
خود آرائی، تن آسانی سے عقدہ وا نہیں ہوگا
سُدلیشی، سادگی، پاکیزگی پر ہو عمل پیرا!
جواں مردی وطن کی ہو رہی ہے آج کیوں رُسوا
اسے رُسوا کیا آرائشِ رخسار و گیسو نے

۱۹۳۲ء

گول میز کانفرنس لنڈن

بھکاری ہیں اور ضد پہ آئے ہوئے ہیں
جو لنڈن میں دھونی رمائے ہوئے ہیں

چھڑائیں وہ اب کس طرح ان سے دامن!
کہ آخر اُنہی کے بُلائے ہوئے ہیں

نہیں اعتبار اِن کو وعدوں پہ اُن کے
کہ دھوکوں پہ دھوکے یہ کھائے ہوئے ہیں

جو اپنے تھے اپنے وطن کی فضا میں
وہاں جاکے وہ بھی پرائے ہوئے ہیں

رکھو دل میں صحرا نشیں[۱] ایسی باتیں
نہ چھیڑو اِنھیں یہ ستائے ہوئے ہیں

[۱] شاعر کا فرضی نام جس سے اکثر نظمیں اخباروں میں شائع ہوئیں۔

کمیشنل اوارڈ

علم و کمال کا نہ لیاقت کا نام لے
محنت سے کام لے، نہ صداقت کا نام لے
ذلت اٹھائے وہ جو شرافت کا نام لے
مطلوب نوکری ہے تو ملت کا نام لے
ہے دور دورہ آج کمیشنل اوارڈ کا
اس ملک میں ہے راج کمیشنل اوارڈ کا

سارے جہاں میں جوہر قابل کی قدر ہے
اہل نظر کے دل میں خصائل کی قدر ہے
انسان کے دماغ کی اور دل کی قدر ہے
حق دوست اور دشمن باطل کی قدر ہے
لیکن یہاں عمل ہے کمیشنل اوارڈ کا
ہر صیغے میں خلل ہے کمیشنل اوارڈ کا

نالائقوں کا مرتبہ اس نے بڑھا دیا
سرکردہ فائقوں کو نظر سے گرا دیا
اچھے بُرے کے فرق کو یکسر مٹا دیا
بُلبل کو زاغ، زاغ کو بُلبل بنا دیا

ہے طرفہ انقلاب کمیُونل اوارڈ کا
ہندی ہیں اور عذاب کمیُونل اوارڈ کا

بھڑکی ہے اس سے فرقہ پرستی کی آگ اور
ہر فرقہ اپنی ڈفلی پہ گاتا ہے راگ اور
ڈھیلی ہوئی سمندِ عداوت کی باگ اور
پھنکارتا ہے آج تعصب کا ناگ اور

ہے اُس کے منہ میں زہر کمیُونل اوارڈ کا
ہندی ہیں اور قہر کمیُونل اوارڈ کا

کونسل میں ہے جو تلخ نوائی اسی سے ہے
ایوانِ معدلت میں بُرائی اسی سے ہے
بازار میں لڑائی بھڑائی اسی سے ہے
شورش ہر ایک سر میں سمائی اسی سے ہے

سب شورشوں میں زور کمیونل اوارڈ کا
ہر سو مچا ہے شور کمیونل اوارڈ کا
تعداد میں فریب کی تعلیم، اسی کا شر
ناپاک اور پاک کی تقسیم، اسی کا شر
ہر فی صدی کے کور کی تنظیم، اسی کا شر
گمراہ رہنماؤں کی تعظیم، اسی کا شر
ہر ایک شر میں شر ہے کمیونل اوارڈ کا
ہر عیب میں ہنر ہے کمیونل اوارڈ کا
ہندوستان کو اس سے الٰہی نجات ہو
انصاف و حق ہوں جس سے نمایاں وہ بات ہو
محتاجِ رنگِ فرقہ نہ حُسنِ صفات ہو
ایسی عروسِ صبح کی خالق یہ رات ہو
ہو جس کو عار غازۂ کمیونل اوارڈ کا
یارب، اُٹھے جنازہ کمیونل اوارڈ کا!

کمیونل اوارڈ

اعلانوں اور فرمانوں سے — بھارت کو خوب ہی جکڑا ہے
پہلے کچھ اور ہی صورت تھی — اب اور طرح سے پکڑا ہے

قیدی کے ہاتھ اور پاؤں میں تھیں — جھوٹے وعدوں کی زنجیریں
تقریروں پہ پابندی تھی — تحریروں پر تھیں تعزیریں

رسّی اب فرقہ داری کی — گردن میں اُس کی ڈالی ہے
کس طاقت سے، کس حیلے سے — یہ پھانسی ٹوٹنے والی ہے

ہشیار قلندر مغرب کا — جب ڈُگڈُگی اپنی بجائے گا
ناچیں گے ہندو، سکھ، مسلم — جو ناچ یہ ان کو نچائے گا

ہندو مسلمان

ہندو مسلماں، ہیں بھائی بھائی
تفریق کیسی، کیسی لڑائی
ہندو ہو کوئی، یا ہو مسلماں
عزت کے قابل ہے بس وہ انساں
نیکی ہو جس کا کارِ نمایاں
ہستی ہو جس کی تصویرِ احساں
اوروں کی مشکل ہو جس پہ آساں
جس کا عمل ہو اور جس کا ایماں
ہر اک سے نیکی، سب سے بھلائی
ہندو مسلماں، ہیں بھائی بھائی

ہندو مسلماں دونوں برابر
دونوں کی خالق وہ ذات برتر
دونوں اسی کی کرتے ہیں پوجا
در پر اسی کے دونوں جبیں سا
اک آستاں ہے دونوں کا قبلہ
مسجد اُسی کی، مندر اُسی کا
دونوں گھروں میں وہ جلوہ فرما
ہندو نے ایشور اُس کو پکارا

بولا مسلماں، اللہ اکبر ہندو مسلماں دونوں برابر

ہندو مسلماں، قومیں پرانی دونوں کی دونوں ہندوستانی
دونوں کا مسکن ہندوستاں ہے وہ بلبلیں ہیں، یہ گلستاں ہے
اک سرزمیں ہے، اک آسماں ہے مدفن وہیں ہے، مولد جہاں ہے
دونوں کا ایک جا سود و زیاں ہے نا اتّفاقی آزارِ جاں ہے
مل جل کے رہنا ہے کامرانی ہندو مسلماں قومیں پرانی

ہندو مسلماں دونوں مہذّب امن و اماں ہے دونوں کا مذہب
دونوں کا ایماں امن و اماں ہے ہنسا سے نفرت اُس کو جہاں ہے
لَا تُفْسِدُوا کا یہ ترجماں ہے ہندو سے مسلم کیوں سرگراں ہے
مُسلم سے ہندو کیوں بدگماں ہے دونوں کا دشمن دورِ زماں ہے
دورِ زماں کا ہے اور مطلب ہندو مسلماں دونوں مہذّب

ہندو مسلماں ہمسائے باہم ہمسائگی کا حق ہے مقدّم
ہمسایہ گر ہو وقفِ اذیّت ہمسائے کو پھر کیوں کر ہو راحت

غم دوسرے کا اک کی مصیبت — راحت ہے اِس کی، اُس کو مسرت
دونوں کو لازم رسمِ مروّت — دونوں کو زیبا ذوقِ محبّت
باہم ہوں دونوں غمخوار و ہمدم — ہندو مسلماں ہمسائے باہم

ہندو مسلماں سوچیں ذرا تو — جھگڑوں سے ناراض ہوگا خدا تو
پھر کس کی خاطر یہ فتنہ و شر — کٹتے ہیں سینے، پھٹتے ہیں کیوں سر؟
آمادگی کیوں با تیغ و خنجر — اک دوسرے کی بربادیوں پر؟
دونوں کا جب ہے ہندوستاں گھر — ہوتا ہے کوئی یوں گھر سے باہر؟
گھر جل گیا، یا گھر گر گیا، تو؟ — ہندو مسلماں سوچیں ذرا تو!

ہندو مسلماں کب تک لڑیں گے — نفرت کے جھنڈے کب تک گڑیں گے
خاکِ وطن میں، اے ہند والو! — اُجڑے چمن کے اے نونہالو
گزری گئی پر اب خاک ڈالو — روٹھے دلوں کو باہم ملا لو
حالت سنوارو، بگڑی بنا لو — صدق و صفا سے سینے بسا لو
کینوں سے خالی کرنا پڑیں گے
ہندو مسلماں کب تک لڑیں گے

دسمبر ۱۹۴۱ء

تضمین

ہند کی تاریخ میں ہم نے پڑھا ہے بارہا
رشکِ فردوسِ بریں یہ خطۂ شاداب تھا
اس کے باشندے تھے حق بیں بے عمل اور باصفا
تھا بہ فیضِ قدرتِ ربِ کریم اس ملک کا
"ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا"

اس کی حالت آہ لیکن رحم کے قابل ہے آج
ہر بلائے ناگہانی کی یہی منزل ہے آج
انقلابِ دہر سے موجِ کرم ساحل ہے آج
گفتۂ غالب کی یہ تصویر یاں ہر دل ہے آج
"عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا"

حالِ وطن

وطن کا حال ہے ناگفتنی، کہئے تو کیا کہئے
کسے الزام دیجے، کس کو اچھّا یا بُرا کہئے
پھنسا اس طرح بے بس ہے ملوکیّت کے پنجے میں
کسی نے کس کے گویا باندھ رکھّا ہے شکنجے میں
رہائی کی کوئی تدبیر چلنے میں نہیں آتی
بُری تقدیر صدیوں سے بدلنے میں نہیں آتی
غریبی، بدنصیبی، تلخ کامی بڑھتی جاتی ہے
وطن کی آہ! میعادِ غلامی بڑھتی جاتی ہے
کرن اُمّید کی طوفانِ استبداد میں گُم ہے
فغانِ صبحگاہی شورِ برق و باد میں گُم ہے

رہا اپنی دعاؤں میں نہ آہوں میں اثر باقی
نہیں خاکسترِ جذبات میں کوئی شرر باقی
یہ ماتم انتزاعِ زندگی کا ہے کہ جینا ہے
یہ عالم "بندگی بیچارگی" کا ہے کہ جینا ہے
رہی خاکِ شہیدانِ وطن بھی بے نشاں ہوکر
ملا مٹی میں خونِ بیگناہاں رائیگاں ہوکر
کئی قربانیاں بیکار ہوکر رہ گئیں آخر
ہزاروں حسرتیں لاچار ہوکر رہ گئیں آخر
ہمارے بہترین انسان پڑے زنداں میں سڑتے ہیں
جو باہر ہیں وہ ہر اک بات پر باہم جھگڑتے ہیں
قفس میں لڑتے ہیں جیسے پرندے دانے دانے پر
معیشت آن پہنچی ہے ہماری اس ٹھکانے پر
ہمارے تفرقوں سے ہنس رہا ہے اک جہاں ہم پر
سیاست کا جو عالم ہے عیاں ہے ایک عالم پر
غلامی جوہرِ انسانیت کو مار دیتی ہے
فنا ہوتی ہے خودداری، شرافت ہار دیتی ہے

تدبر ہے ہمارا فرقہ داری، فرقہ آرائی
نحوست کا ستارا، فرقہ داری، فرقہ آرائی
کوئی کہتا ہے پاکستان ہمیں جب تک نہیں ملتا
ہمیں بربادیٔ ہندوستاں کی کچھ نہیں پروا
کوئی کہتا ہے تقسیمِ وطن ہونے نہ دیں گے ہم
نزاعِ دائمی کا تخمِ نو بونے نہ دیں گے ہم
غرض ایسے ہی ہنگاموں سے طاقت گھٹتی جاتی ہے
جو اصلی کام ہے اس سے توجہ ہٹتی جاتی ہے
یہی حالات ہیں تو اور بھی بدحال کر دے گی
غلامی ہند کے شہر کو بنگال کر دے گی

نوائے وقت

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں

نازل سرِ آفاق ہوا قہرِ الٰہی
امن اور اماں سوئے عدم ہو گئے راہی
منزل گہہِ مہتاب سے تا مسکنِ ماہی
ہیں محوِ عمل سینکڑوں ارکانِ تباہی
جو ملک ہے برباد ہے بارش سے بموں کی
دنیا میں جو بستی ہے وہ بستی ہے غموں کی
جانباز جواں نذرِ فنا ہو گئے لاکھوں
ماں باپ سے دلبند جدا ہو گئے لاکھوں
معصوم غریب الغربا ہو گئے لاکھوں
مظلوم یتیموں سے سوا ہو گئے لاکھوں
سرتا بقدم نالہ و فریاد ہیں مائیں
بیواؤں کی آہوں سے ہیں معمور فضائیں

یہ جنگ نہیں بلکہ خود آئی ہے قیامت

پیغامِ دِغا دہر میں لائی ہے قیامت

توپوں کی دنا دن نے مچائی ہے قیامت

فولاد کے دیوؤں کی لڑائی ہے قیامت

وہ آگ اُگلتے ہوئے ٹینکوں کی چڑھائی

اک آن میں بستے ہوئے شہروں کی صفائی

محفوظ نہ خشکی نہ تری ہے نہ فضا ہے

بگڑی ہوئی معمورۂ عالم کی ہوا ہے

بارود کے پھٹنے سے زمیں زلزلہ زا ہے

ہنگامۂ محشر سرِ افلاک بپا ہے

منڈلاتے ہیں بمبار قضا بن کے جہاں پر

برساتے ہیں میںہ آگ کا جاندار کی جاں پر

اس آگ نے آرام کسی گھر میں نہ چھوڑا

جینے کا سہارا دلِ مضطر میں نہ چھوڑا

بے داغ نظارا مہ و اختر میں نہ چھوڑا

لوہے کے جہازوں کو سمندر میں نہ چھوڑا

ہم پایۂ فردوسِ بریں تھے جو خیاباں
شعلوں کی لپٹ سے ہوئے جل کر وہ بیاباں
اس آگ سے کچھ دُور جو قطعاتِ زمیں ہیں
وہ بھی اثرِ جنگ سے محفوظ نہیں ہیں
ہے قحط وہاں اور وبائیں بھی وہیں ہیں
ویراں ہیں مکاں اور زبوں حال مکیں ہیں
اچھے رہے مردانہ جو میداں کو سدھارے
کس گنتی میں ہیں مر گئے جو بھوک کے مارے
شانِ کرم اے خالقِ غفّار دکھا دے
اس آگ کو الطاف کے چھینٹوں سے بجھا دے
ہر بانیٔ بیداد کی ہستی کو مٹا دے
دے امن و اماں دہر کو اور صدق و صفا دے
اب رحم کہ رحمت کے سزاوار بہت ہیں
بندے ہیں ترے گرچہ گنہگار بہت ہیں

قحطِ ہند

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں

اے کشورِ ہندوستاں
اے انتخابِ دوجہاں
برسا رہا ہے آسماں
سارے جہاں پر بجلیاں
محفوظ ہر آسیب سے
لیکن ہے تیرا گلستاں
اقطاعِ عالم بیش و کم
ہیں تختۂ مشقِ ستم
پیہم کہیں گرتے ہیں بم
پھٹتے ہیں گولے دمبدم
اور آگ برساتے کہیں
غولانِ آتش ہیں رواں

ہے مہرباں قدرت، مگر اے ہند تیرے حال پر
گلزارِ عالم بیشتر! آتش بجاں، آتش بہ سر
لیکن ہے تیری کِشت پر
ابرِ کرم گوہر فشاں

ہمدرد قدرت بھی یہاں انساں کی محنت بھی یہاں
زہد و ریاضت بھی یہاں صبر و قناعت بھی یہاں
ہر سال پھر نازل ہے کیوں
یہ قحط کی لعنت یہاں

یہ بُھوک، یہ رنج و تعب لاکھوں، کروڑوں جاں بلب
اتنا ستم، ایسا غضب آخر ہے کیا اس کا سبب!
اس کا سبب وہ بےبسی
ممکن نہیں جس کا بیاں

قحطِ بنگال

دوسری جنگِ عظیم کے موقع پر

غلامی میں نہیں ہے اِن سے بچنے کا کوئی چارا
یہ لڑتے ہیں جہاں سے اور ہم پر بوجھ ہے سارا
بجانے کے لیئے اپنی جہانگیری کا نقّارا
ہماری کھال کھنچواتے ہیں، دیکھو تو یہ نظّارا
بظاہر ہیں کرم پرور، بباطن ہیں ستم آرا
یہ اپنی ذات کی خاطر ہیں سب کی جان کے دشمن
ہیں خوں آشام ہر حیوان کے، انسان کے دشمن
کبھی ہیں چین کے دشمن، کبھی ایران کے دشمن
ہمارے دوست بھی کب ہیں جو ہیں جاپان کے دشمن
اُسے بندوق سے مارا تو ہم کو بھوک سے مارا

قحطِ بنگال

قطعہ

بارشِ بم سے اے وطن، تو جو بچا تو کیا ہوا
قحط و وبا کے تیر ہیں تیرے لئے قضا کے پاس
تیری مصیبتوں کی نذر اشکِ رواں و داغِ دل
اس کے سوا ہے اور کیا شاعرِ بے نوا کے پاس

اشعار

اے مستِ مئے بے خبری، حالِ جہاں دیکھ
سرحدِ فنا ہے یہی، پہنچا ہے کہاں، دیکھ

خونخوار بلائیں ہیں ترے سامنے، غافل
قحط اور وبائیں ہیں ترے سامنے، غافل
کیا اہل وطن کا تجھے غم کچھ بھی نہیں ہے
بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے
افسانۂ عبرت ہوئی ویرانیٔ بنگال
مذکورِ کہن ہے چمنستانیٔ بنگال
سڑتی ہیں پڑی کوچہ و بازار میں لاشیں
ہیں نقشِ طرب دیدۂ اغیار میں لاشیں
سفاک بہت خوش ہیں تباہی پہ ہماری
یہ جوز ہے ناکردہ گناہی پہ ہماری
بنکم کے ترانوں کا وطن نالہ کناں ہے
ٹیگور کے نغموں کا چمن وقفِ خزاں ہے
جس خطّے سے اُٹھی تھی صدا حُبِّ وطن کی
ملتی ہے اُسے آج سزا حُبِّ وطن کی
ٹوٹا نہ اگر حلقۂ زنجیرِ غلامی
اس سے بھی خطرناک ہے تقدیرِ غلامی

ہولی

مسرّت کا ہولی جو لائی پیام جہاں سُن کے اُس کو ہوا شاد کام
فلک پر شفق رنگ اُڑانے لگی فضا چار سُو مُسکرانے لگی!
ہُوا شہر میں جشن کا اہتمام بھرے لالہ و گل نے گلشن میں جام
اِدھر گھر کے ابرِ بہار آگیا اُدھر جھُوم کر بادہ خوار آگیا
ہیں چاروں طرف عیش کے رنگ ڈھنگ
مگر دل میں دیکھی نہ کوئی اُمنگ
کہا میں نے دل سے کہ اے نامراد کبھی تجھ کو پایا نہ پہلو میں شاد
زمانے سے ہے تیری خو بُو الگ کہ رہتا ہے ہر عیش سے تُو الگ

خوشی ہو کوئی، کوئی تیوہار ہو   ہے تصویرِ حسرت ترے روبرو
بپا آج ہولی کا ہنگامہ ہے   کہ ارزانیٔ عشرتِ عامہ ہے

مگر آج بھی تُو ہے خلوت نشیں
ترا رازِ غم ہم پہ کھُلتا نہیں

گراں دل پہ گزرا یہ میرا خطاب   ہُوا اور بھی مائلِ اضطراب
کہا اُس نے یوں کھینچ کر آہِ سرد   بہ صد حسرت و رنج و افسوس و درد
کہ اے چشمِ ظاہر سے نظارہ بیں   حقیقت پہ تیری نظر ہی نہیں
اگر کھولتا تو ذرا چشم و گوش   نہ بھاتی تجھے عشرتِ ناو نوش
یہ آتی ہے جو چنگ و نَے کی صدا   ہے دراصل ماتم تری قوم کا
غلامی میں ہولی مناتے ہیں جو   اسیری میں یوں چہچہاتے ہیں جو
وہ ہیں ماضی و حال سے بےخبر   نہ آئندہ احوال پر ہے نظر
ہوئے پس کے خاک اور خوشحال ہیں   سرافراز ہیں گرچہ پامال ہیں
ہوئی عالمِ یاس میں آس گم   غلامی کی ذلّت کا احساس گم
نہ دیرینہ عظمت کا اُن کو خیال   نہ موجودہ ذلّت سے دل کو ملال
نہ اندیشہ کچھ اُن کو انجام کا   نہ خدشہ انھیں دورِ ایّام کا
مناتے ہیں ہولی، یہ گاتے ہیں گیت   چلاتے ہیں اپنے بزرگوں کی ریت

نہیں ہے مگر اُن کو اتنی تمیز — بزرگوں کی ہولی تھی کچھ اور چیز
وہ آزاد تھے اور دلشاد تھے — مسرّت سے دل اُن کے آباد تھے
وہ حق اور صداقت کے پابند تھے — حقیقت میں شاد اور خورسند تھے
انھیں زیب دیتا تھا چنگ و سرود — کہ تھے صاحبِ شان و نام و نمود

وہ تھے سُرخ رُو، اور عبیر و گلال
انہی سُرخ رویوں کے تھے حسبِ حال

مگر ہم غلام اور ابنِ غلام — کریں اُن کی تقلید کا اہتمام؟
اگر ملک و ملّت کے حالات پر — کریں غور تو صاف آئے نظر
کہ ہم پر ہے عیش و مسرّت حرام — ہے آسودگی اور راحت حرام
کہیں قحط ہے اور وبا ہے کہیں — فلک سے نزولِ بلا ہے کہیں
فدا بھوک پر جان کرتے ہیں لوگ — گلی اور کوچوں میں مرتے ہیں لوگ
کہیں زر پرست اور سرمایہ دار — غریبوں کی عصمت پہ کرتے ہیں وار
وطن کے فدائی جو ہیں دردمند — ٹھُسے ہیں وہ مجبور زنداں میں بند
غضب ہے کہ ہم آبرو ہار کے — ہوں وارث بزرگوں کے تیوہار کے
ترانے یہ بےوقت کے راگ ہیں — لنگوٹی میں ہم کھیلتے پھاگ ہیں
بزرگوں کی عزّت ہے ہم میں نہ شان — نہ وہ زورِ بازو نہ وہ گیان دھیان

وہ مالک تھے خود اپنے ارمانات کے
وہ آقا تھے خود اپنے حالات کے
مگر ننگِ اسلاف ہم آج ہیں
کہ بے دست و پا اور محتاج ہیں
عمل میں نہیں اُن کی تقلید اگر
تو کیا حق ہمیں اُن کے تیوہار پر

جو ہولی منانے کا ہے تم کو شوق
تو پیدا کرو دل میں پہلے یہ ذوق
رواں ہوں وطن کے لیے اشکِ خوں
کہ ہو سر زمینِ وطن لالہ گوں
نمایاں ہو پھر اس سے ہولی کا رنگ
ہر اک دل میں پیدا ہو رنگیں اُمنگ
وطن کی محبّت، وطن کا وقار
غلامی سے نفرت، غلامی سے عار

اشعار

فاقہ مستی میں یاد ہے کس کو
مے و مینا و جام کی ہولی
دل کی رنگینیاں ہوئیں رخصت
رہ گئی اب تو نام کی ہولی
دِل رُبا ہے شفق کی رنگینی
خُوب ہے صبح و شام کی ہولی

نیتاجی

سبھاش چندر بوس

غلامی میں ابتر تھی حالت وطن کی — ہوئی روح فرسا اذیت وطن کی
کہاں چین تجھ سے محبتِ وطن کو — لٹیروں نے لوٹی جو راحت وطن کی
کیا مضطرب تیری غیرت نے تجھ کو — نہ دیکھی گئی تجھ سے ذلت وطن کی

دلِ پُر حمیت سے پا کر اشارا
کیا رنجِ غربت کو تو نے گوارا

وطن کے لئے بے وطن ہو کے نکلا — سراپا اسیرِ محن ہو کے نکلا
وقارِ وطن تجھ سے پھیلا جہاں میں — چمن سے شمیمِ چمن ہو کے نکلا
یہیں راحتِ قصر و ایواں کو چھوڑا — طلبگارِ گور و کفن ہو کے نکلا

ہوئی کارگر تیری تدبیر آخر
کہ ٹوٹی غلامی کی زنجیر آخر

آزادِ ہند فوج

عزیز جگن ناتھ آزاد کی نظم اسی عنوان سے کسی جریدے میں شائع ہوئی۔ ٹیپ کا مصرعہ مجھے بہت پسند آیا۔ اسی کو لے کر یہ چند بند موزوں ہوگئے۔ دونوں نظمیں اس وقت کہی گئیں جب یہ فوج ابھی برما میں مصروفِ عمل تھی۔

اے جیشِ سرفروشِ جوانانِ خوش نہاد
سینے پہ تیرے کُند ہوئی تیغِ استبداد
غربت میں تو نے دی ہے شجاعت کی خوب داد
اقوامِ دہر کرتی ہیں جرأت پہ تیری صاد
تو کامراں رہے، ترے دشمن ہوں نامراد
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

دریا و دشت و کوہ میں تیرا بگل بجے
جس کی صدا سے گنبدِ گردوں بھی گونج اُٹھے

میداں میں موت بھی جو مجسم ہو سامنے
تیرے دلاوروں کے نہ ہوں پست حوصلے
ہو بلکہ اُن کا اور بھی جوشِ عمل زیاد
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

پردیس میں جو کھیت رہے ہیں جواں ترے
ہیں دفن زیرِ خاک خزانے وہاں ترے
برما کے جنگلوں میں لہو کے نشاں ترے
نقشِ دوام ہیں وہ بزیرِ آسماں ترے
تا روزِ حشر اہلِ وطن کو رہیں گے یاد
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

آزادیٔ وطن کی تمنائے دل نواز
زنداں میں گھُٹ کے رہ گئی، یا دل میں مثلِ راز
کہتے تھے جرم جس کو حکومت کے حیلہ ساز
تیرے عمل سے اُس کو ملی خلعتِ جواز
اب "حق" ہے جس کا نام رہا "غدر اور فساد"
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

غالب تھا بسکہ ساحرِ افرنگ کا فسوں
دو سو برس سے تھا عَلَمِ ہند سرنگوں
تو نے دیارِ غیر میں دکھلا دیا کہ یوں
مردانِ کار کرتے ہیں باطل کو غرقِ خوں
باطل ہو خواہ کوہِ گراں، خواہ گِرد باد
"ہندوستاں کی فوجِ ظفر موج زندہ باد"

حملہ آور

جب کسی ملک کی چھاتی پہ چڑھ آتا ہے غنیم
دونوں ہاتھوں سے گلا اس کا دباتا ہے غنیم
بجلیاں قہر کی ہنس ہنس کے گراتا ہے غنیم
غرض آثار قیامت کے دکھاتا ہے غنیم

ٹوٹ پڑتا ہے زر و مال پہ ڈاکو بن کر
ننگ و ناموس پہ گرتا ہے ہلاکو بن کر

قتلِ انساں سے نہ جب تک کہ ہو گُلرنگ زمیں
حملہ آور کو نہیں ہوتی ہے حاصل تسکیں
اس کو ہر منظرِ خونیں ہے بہارِ رنگیں
دامنِ آز کی کرتا ہے لہو سے تزئیں

اس سے ہو سکتی ہے کیا مہر و وفا کی اُمّید
دشمنِ حق سے ہو کیا صدق و صفا کی اُمّید

ہر قدم پر جور وا دارِ جفا ہوتا ہے
وہ کہاں مائلِ اندازِ وفا ہوتا ہے

شرمِ خلقت نہ اُسے خوفِ خدا ہوتا ہے

خون کا چسکا جو پڑ جائے بُرا ہوتا ہے

قتل و غارت کے سوا اور اُسے کیا آتا ہے

اہلِ عالم کی تباہی میں مزا آتا ہے

نذرِ آتش ہوں اگر بستے ہوئے شہر، وہ خوش

بند پانی کی ہو محصُور پہ گر نہر، وہ خوش

آسمانوں سے برستا ہے اگر قہر، وہ خوش

اپنی غیرت سے جو کھاتا ہے کوئی زہر، وہ خوش

بے اثر نالہ و فریاد ہیں اس کے آگے

خوش ہے، مظلوم جو ناشاد ہیں اس کے آگے

حملہ آور کے لیے خونِ بشر پانی ہے!

اس کی فطرت میں ہوس اور ستم رانی ہے

ماضی و حال میں اک فطرتِ انسانی ہے

جو خلاف اس کے ہے اُمّید تو نادانی ہے

اپنی سرحد سے اسے دُور ہی رکھنا بہتر

اس کے اعمالِ زبوں کو نہ پرکھنا بہتر

وطن کے سپاہی

وطن کے سپاہی دلاور بڑے ہیں		تباہی مچا دی، جہاں جا پڑے ہیں
یہ جانباز جس مورچے پر لڑے ہیں		وہیں ان کی شہرت کے جھنڈے گڑے ہیں

ازل سے یہ ہیں خوگرِ سرفروشی
سراپا وفا پیکرِ سرفروشی

سبق جو پڑھایا انھیں، پڑھ گئے یہ		کہا ان کو جس ملک پر، چڑھ گئے یہ
بڑھایا جدھر کو، اُدھر بڑھ گئے یہ		گڑھے پھاند کر، توڑ کر گڑھ گئے یہ

نہ بم سے جھجکنا، نہ توپوں سے ڈرنا
انھیں کھیل ہے مارنا اور مرنا

کبھی چین میں چینیوں کو دبایا　　کبھی دُور سے روسیوں کو ڈرایا
کبھی جاکے کابل میں سکّہ بٹھایا　　کبھی کر دیا جرمنی کا صفایا

عراقِ عرب میں کبھی دندنائے
کبھی جاکے افریقہ کو روند آئے

قدمبوس اُن کی ہوئی خاکِ ایراں　　فرانسیس اِن کے تہوّر پہ قرباں
کیا اُن کی یُورش نے اٹلی کو ویراں　　ہوا اُن کی ہیبت سے جاپان بے جاں

غرض ایک عالم میں ہے دُھوم اِن کی
ثنا دفتروں میں ہے مرقوم اِن کی

مگر ان سے پوچھے کوئی اے یگانو!　　زمینِ شجاعت کے اے آسمانو!
کبھی کی ہے کوشش کہ تم یہ بھی جانو!　　تمھارا وطن کس لئے اے جوانو!

اسیرِ مصیبت، رہینِ بلا ہے
غلامی کے پھندوں میں جکڑا ہوا ہے

مُبارک باد

دوسری جنگِ عظیم میں انگریزوں کی فتحیابی پر

یہ فتح تم کو مبارک، مگر ہمیں کب تک
رہینِ بیم و رجا زیرِ دام رکھنا ہے
یہ فتح تم کو مبارک، ہمارے آقاؤ
کہو کہ اب ہمیں کب تک غُلام رکھنا ہے

یہ فتح تم کو مبارک، مگر بڑھیں نہ کہیں
گھٹائیں جانبِ بنگال پھر نحوست[1] کی
فضائے دل میں پہنچتی نہیں، وہ ہرگز
صدائیں کانوں میں آتی ہیں جو مسرّت کی

[1] قحطِ بنگال کی طرف اشارہ ہے

یہ فتح تم کو مبارک، مگر ہمارے دل
ہجومِ غم میں شکست آشنا ہیں مدّت سے
تمھارے سر سے تو آئی بلا ٹلی، لیکن
اِدھر بھی دیکھو کہ وقفِ بلا ہیں مدّت سے

یہ فتح تم کو مبارک، کہ سرفراز ہو تم
ہم اس پہ اس لئے خوش ہوں کہ سرنگوں ہیں ہم؟
خجستہ کام و ظفریاب و کامراں ہو تم
خراب و خستہ، زبوں حال و بدشگوں ہیں ہم

یہ فتح تم کو مبارک کہ جس سے شکریہ[1]
بلاکشوں کا، تمھاری زباں پہ آیا ہے
نہیں رہی کشش اب کوئی اس فسانے میں
کہ تم نے پہلے کئی بار یہ سنایا ہے

[1] فتح یابی کے بعد انگلستان نے سرکاری طور پر ہندوستان کا شکریہ ادا کیا تھا۔

شاباش

برطانیہ کا لکچر ہندوستانی سپاہیوں کے سامنے

شاباش، بہادرو، دلیرو　　میدانِ محاربہ کے شیرو
فی النّار ہوا ہے ایک[1] دشمن　　باقی ہے ابھی اِک[2] اور پُرفن
اس سے بھی زیادہ سخت جاں ہے　　خونخوار، عدوّ ایں و آں ہے
پہلے سے زیادہ جوش کے ساتھ　　دکھلاؤ بہادری کے تم ہاتھ
پہلے سے بہت زیادہ جرأت　　پہلے سے بہت فزوں شجاعت
پہلے سے زیادہ ساز و ساماں　　پہلے سے بہت زیادہ انساں
پہلے سے زیادہ قتل و غارت　　مکر و فن و حیلہ و جسارت
پہلے سے زیادہ قحط سالی　　پہلے سے سوا خراب حالی

[1] جرمنی [2] جاپان

پہلے سے زیادہ بدگمانی   پہلے سے زیادہ سر گرانی
پہلے سے بہت زیادہ نایاب   زندہ رہنے کے جملہ اسباب
پہلے سے زیادہ شورِ ماتم   پہلے سے زیادہ گریۂ غم
پہلے سے بہت کڑے قوانیں   پہلے سے بڑے بڑے قوانیں
پہلے سے بہت یتیم بے بس   پہلے سے زیادہ لوگ بے کس

بعد اس کے تمام خیر سلّا!
مارو گے جو دم تو مارشل لا!

رفاقت

رفاقت ہے مہرِ ضیا بارِ ہستی　　رفاقت سے روشن شبِ تارِ ہستی
رفاقت سے شادابِ گلزارِ ہستی　　گُلِ تر رفاقت سے ہر خارِ ہستی
غم و رنج و اندوہ و کُلفت کی دُنیا
رفاقت سے بنتی ہے فرحت کی دُنیا

رفاقت سے ہوتے ہیں افراد نامی　　رفاقت سے ہوتی ہے مِلّت گرامی
رفاقت سے کُھلتے ہیں بندِ غلامی　　رفاقت ہے سرمایۂ شاد کامی
رفاقت ہے شیرازہ بندی وطن کی
رفاقت میں ہے دردمندی وطن کی

رفاقت نہیں ہے تو رنج و تعب ہے — رفاقت نہیں ہے تو غیظ و غضب ہے
رفاقت ہمیشہ تبسم بہ لب ہے — رفاقت کا عالم جہانِ طرب ہے
رفاقت سے صحرا میں صورت چمن کی
رفاقت سے غربت میں راحت وطن کی

رفاقت کو اہلِ وطن نے بھلایا — تو پھل اس کا فتنوں کی صورت میں پایا
عجب آتشِ کیں سے دل کو جلایا — کوئی ان سے پوچھے کہ کیا ہاتھ آیا
جہاں میں کہیں اپنی عزّت نہیں ہے
زمانے کی نظروں میں وقعت نہیں ہے

اگر شاہراہِ رفاقت پہ ہولیں — گرہ دل میں جو پڑ گئی اس کو کھولیں
دلوں سے عداوت کے داغوں کو دھولیں — کبھی بھول کر بول کڑوا نہ بولیں
تو ہرگز کٹھن ہو نہ منزل ہماری
ہو آسان ہر ایک مشکل ہماری

راہبرِ راہِ رفاقت

جو نفس کے دیوانے ہیں لڑتے ہیں وہ باہم
پرخاش کی حامل نہیں مذہب کی صداقت
قائل نہ ہو جس کا دلِ بیزارِ برہمن
کس کام کی اے حضرتِ واعظ وہ طلاقت
دل شیخ کا تاثیر سے جس کی نہ پسیجے
پنڈت جی مہاراج کتھا ہے وہ حماقت
اخلاق کے پتلے تھے یہیں مسلم و ہندو
جب تک انھیں ملتی رہی تعلیم لیاقت
اے اہلِ وطن اس سے کوئی کام نکلتا
آپس کی لڑائی سے جو ضائع ہوئی طاقت
ممکن ہے بہے ہند میں پھر پریم کی گنگا!
پنجاب ہوا راہبرِ راہِ رفاقت

غزل

بسنت کی تقریب پر

محروم، وطن جب تک آزاد نہیں ہوتا
سو بار بسنت آئے، دل شاد نہیں ہوتا

اس باغ کو اے گلچیں تاراج کیا تو نے
برباد ہوا ایسا، آباد نہیں ہوتا

مرغانِ چمن گائیں کیا نغمۂ آزادی
نظروں سے نہاں جب تک صیّاد نہیں ہوتا

یہ شامِ غریباں ہے یا صبحِ وطن اپنی
ہم سا کوئی دنیا میں برباد نہیں ہوتا

دل شاد نہیں ہوتا ایّامِ طرب میں بھی
محروم، وطن جب تک آزاد نہیں ہوتا

یادِ اتحّاد

کل تک تھے جان و دل سے جو خواہانِ اتحّاد
بیٹھے ہیں آج توڑ کے پیمانِ اتحّاد

ہے دل میں اُن کے آج تمنّائے افتراق
کل تک تھے جن کے پہلو میں ارمانِ اتحّاد

حیرت اس انقلاب پہ ہے دل کو اے خدا
شیدائے بغض و کیں ہیں محبّانِ اتحّاد

شیخ اور برہمن میں کشاکش ہے زور کی
اور اس سے پُرزے پُرزے ہے دامانِ اتحّاد

سینچا گیا تھا خونِ شہیداں سے جو کبھی!
تاراج ہو گیا وہ خیابانِ اتحّاد

شامِ فراق کی ہے اُداسی برس رہی
سُونی پڑی ہے آہ شبستانِ اتحّاد

تاریک مثلِ کوچۂ گیسو ہوا یہ مُلک!
جب سے نہاں ہوا رُخِ تابانِ اتحّاد

ہے بڑھتی جا رہی شبِ بختِ سیاہِ ہند
یارب کدھر ہے نیّرِ رخشانِ اتحاد

اے اہلِ ہند! کچھ تو کرو ان کا پاس تم
جو سرفروش ہو گئے قربانِ اتحاد

زندانِ تنگ و تار میں ہیں وقفِ سوزِ غم
وہ جن سے تھا فروغِ نمایانِ اتحاد

اُن کی شبانہ روز کی محنت سے جو بنا
تم نے گرا دیا ہے وہ ایوانِ اتحاد

عیّاریوں پہ اپنی ہیں دلشاد راہزن!
اور تم لُٹا کے بیٹھے ہو سامانِ اتحاد

ہاں، اتحاد ہے سببِ شوکتِ وطن
للّٰہ پھر دکھا دو وہی شانِ اتحاد

کینے بُھلا کے ہندو و مُسلم گلے ملیں!
پھر کاش آئے ہند میں دورانِ اتحاد

محرومؔ ہم بھی کرتے ہیں اہلِ وطن کی نذر
یہ چند شعر لکھ کے بہ عنوانِ اتحاد

خیر مقدم

آزاد ہند فوج کے جنرل شاہنواز اور چند اور افسر جنوری ۱۹۴۶ء میں راولپنڈی تشریف لائے۔ اُن کے اعزاز میں یہ نظم موزوں ہوئی۔ (محروم)

مرحبا اے سرفروشانِ وطن، صد مرحبا
اے فروغِ چشمِ حیرانِ وطن، صد مرحبا

فرش اپنے دیدہ و دل ہیں تمھاری راہ میں
آج تم آنکھوں میں ہو، تم دل کی خلوت گاہ میں

دیکھ کر تم کو وطن مسرور ہے، دل شاد ہے
حلقۂ طوقِ غلامی اب کہاں؟ آزاد ہے!

اک اُجالا سا نظر آتا ہے، جب سے آئے ہو!
شمعِ روشن بزمِ تاریکِ وطن میں لائے ہو

ہر رگ و پے میں تمھارے سوزِ دل کا ہے اثر
شعلۂ حبِّ وطن بھڑکا ہے تم کو دیکھ کر

ہر زباں پر نعرۂ مستانہ ہے "جے ہند" کا
رُوح پرور نعرۂ مستانہ ہے "جے ہند" کا

ہند کے چھوٹے بڑے "جے ہند" کے دلدادہ ہیں
جنگِ آزادی میں جاں دینے پہ سب آمادہ ہیں

پھر شرر افشاں ہوئی ہے ہند کی افسردہ خاک
جگمگا اٹھی ہے مقدم سے تمھارے مُردہ خاک

آگئی ہے لوٹ کر صدیوں کے بے جانوں میں جان
ڈال دی ہے تم نے آزادی کے ارمانوں میں جان

جو محبانِ وطن مارے گئے یا مر گئے
حسرتِ آزادیٔ ہندوستاں لے کر گئے

شاد ہوں گی اُن کی روحیں عالمِ بالا میں آج
آرزو ہوگی کہ واپس آئیں پھر دنیا میں آج

واپس آئیں اور بارش تم پہ پھولوں کی کریں
گیت آزادی کے گائیں جشنِ استقبال میں

اے شجاعو! اے دلیرو! اے جوانو! مرحبا
اے وطن کی آبرو کے پاسبانو! مرحبا
اے بہارِ رفتہ کے رنگیں فسانو! مرحبا
مرحبا اُجڑے چمن کے باغبانو! مرحبا
تیاگ بُدھ کا، گیان ارجن کا تمھیں حق نے دیا
عزم حیدر اور ایثارِ شہیدِ کربلا
ولولے پرتاپ کے، دل اور جگر دشمیش کا
الغرض ہر وصف احرارِ صداقت کیش کا
ورنہ ایسی آگ میں پڑنا کوئی آساں نہ تھا
انقلابِ دَور کا اس دَور میں امکاں نہ تھا
ذہن پر، دل پر غلامی کی پڑی زنجیر تھی
تم نے توڑا ہے جسے شیرو! کڑی زنجیر تھی
آگ میں کُودے ہو تم اور بن کے کُندن آئے ہو
موت سے لڑ کر وطن کی زندگانی لائے ہو
ہند رہ سکتا نہیں ہے اب غلاموں کا وطن
نامرادوں، بدنصیبوں، تلخ کاموں کا وطن

پیٹ کے بل ہم بہت رینگے ہیں کیڑوں کی طرح
لاٹھیاں بھی، گولیاں بھی کھائی ہیں اچھی طرح
ہم رہیں گے کیا ہمیشہ کے لیے خوار و ذلیل
اور سمجھے جائیں گے اقطاعِ عالم میں رذیل
اب تو ہم اس ذلّت افزا زندگی سے تنگ ہیں
جھٹکے احساسِ غلامی کے جنوں آہنگ ہیں
اب اگر جینا ہے تو جینا ہے آزادی کے ساتھ
جنگ ہے اپنی غلامی اور بربادی کے ساتھ
یا غلامی اور بربادی کا ہوگا خاتمہ
یا ہماری بے حمیت زندگی کا خاتمہ!

پنجاب ہمارا

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ وطن سے کچھ پہلے کہی گئی

ہوتا ہے وطن یوں تو ہر اک شخص کو پیارا
لیکن ہے حقیقت میں دل آویز و دل آرا
پنجاب ہمارا

دریائے رواں، سبزہ و گل، وادی و کہسار
ایسے ہی نظاروں سے ہے فردوسِ نظارا
پنجاب ہمارا

کھیتوں کی یہ وسعت، یہ کسانوں کی کمائی
ان دونوں سے ہے ہند کے جینے کا سہارا
پنجاب ہمارا

جوہر ہیں یہاں حسن و شجاعت کے درخشاں
ہے رشکِ صفاہان و سمرقند و بخارا
پنجاب ہمارا
ہیں گلشنِ آفاق میں گر پھول ممالک
لاریب ہے خوش رنگ و سرافراز ہزارا
پنجاب ہمارا

بگڑے ہوئے پنجاب سے

آدمیت کے لباسِ برتری کو پھاڑ کر
شوقِ عریانی میں یہ رقصِ جنوں اے فتنہ گر!
تو نے اپنی بربریت کے دکھائے وہ ہنر
خاک میں جن سے ملی توقیرِ انساں سر بہ سر
آسمانوں سے صدا آئے گی یہ شام و سحر
حیف اے پنجاب تجھ پر، اور تری تہذیب پر

شب کی تاریکی میں بن کر بھوت او خانہ خراب
شیطنت کی پی کے نکلا گھر سے تو اپنے شراب
لُوٹ مار، آتش زنی میں، ہو کے آخر کامیاب
کر دیا جلتے مکانوں میں مکینوں کو کباب
بن گئے اپنے مکینوں کے لئے شمشان گھر
حیف اے پنجاب تجھ پر، اور تری تہذیب پر

الاماں، دیہات میں منظر وہ قتلِ عام کا
لُوٹ سے تیری نہ عصمت، اور نہ مال و زر بچا

رحم تو نے عورتوں پر اور نہ بچوں پر کیا
تشنۂ خوں کب سے تھا اے سنگدل خنجر ترا
کر دیا تو نے نظامِ زندگی زیر و زبر
حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر

آج تک دیکھی سنی ہے کس نے ایسی سرزمیں
بیگناہوں، امن خواہوں کو اماں جس میں نہیں
چیر ڈالیں شیر خواروں کے جگر ارباب کیں
بھون ڈالے جائیں یوں اپنے مکانوں میں مکیں
اس شقاوت کو شجاعت نام دیں از راہِ شر
حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر

کیا اسی مصرف کو تھے یہ خنجر و تیغ و تفنگ
گھر میں چوری سے ترا رکھا ہوا سامانِ جنگ
تو نے میداں زندگی کا اپنے ہمسایوں پہ تنگ
اپنی نیت سے کیا ہے یا بہ ایمائے فرنگ
لائقِ نفریں بہرصورت ہے، قصہ مختصر!
حیف اے پنجاب تجھ پر اور تری تہذیب پر

راولپنڈی۔ مارچ ۱۹۴۷ء

اہلِ وطن کی خدمت میں

ہند کے ہندوؤ، مسلمانو! — عقل سے کام لو، کہا مانو
فرضِ ہمسائگی کو مت بھولو — اپنی یکرنگی کو مت بھولو
یوں نہ اک دوسرے پہ وار کرو — فائدہ کیا کہ مارو اور مرو
ستمِ ناروا سے کام لیا — اور مذہب کا اس میں نام لیا
اس سے مذہب بھی ہو گیا بدنام — اور ہوئے تم بھی موردِ الزام
ساری دنیا میں ہو گئے رسوا — ہے مقدر یہی غلاموں کا
نہ یہ مذہب ہے، نہ سیاست ہے — بربریت ہے اور وحشت ہے
گھر سے نکلو، گھروں کو آگ لگاؤ — بیکسوں، بے بسوں کو اس میں جلاؤ

بے گناہوں کو راہ چلتوں کو — گھیر لو اور ذبح کر ڈالو
چیختی عورتوں پہ وار کرو — نیزے بچوں کے دل سے پار کرو
کیا یہی چیز آدمیت ہے؟ — یہی مذہب؟ یہی شرافت ہے؟
کیا اہنسا کی ہے یہی تعبیر؟
یہی "لا تُفسدوا" کی ہے تفسیر؟

ختم اک دوسرے کو کرنے کا — عزمِ بے جا اگر ہے تم نے کیا
تو یہ سمجھو کہ وہم ہے یکسر — خللِ عقل و فہم ہے یکسر
ختم ہوگی نہ ملّتِ اسلام — اور نہ ہندو کا مٹ سکے گا نام
مگر اِس کا مآل یہ ہوگا — بیج بویا ہُوا عداوت کا
پھُوٹ کر ہوگا باعثِ آزار — اک تناور درخت آخرِ کار
کینہ و بُغض کا ثمر دے گا — زندگی سب کی تلخ کر دے گا
کھاؤ گے اِس شجر کا پھل برسوں
اور پاؤ گے تم نہ کل برسوں

راولپنڈی مارچ ۱۹۴۷ء

پنجاب کی آبرو

افسوس! وطن کی سرزمیں پر — نازل ہے عذابِ آسمانی
نایاب ہوا ہے، بلکہ موہوم — اس دور میں لطفِ زندگانی
کمیاب ہوئے ہیں بلکہ معدوم — اوقاتِ عزیز شادمانی
خالی ہوئے اعتماد سے دل — نظریں ہیں رہینِ بدگمانی
معمور ہوئے فساد سے دل — احباب ہیں وقفِ سرگرانی
ہر بات میں زہر کی ملاوٹ — ہر گھات میں مرگِ ناگہانی
ہر راہ میں اک نئی رکاوٹ — ہر گام اسیرِ پاسبانی

کیا صدق و صفا کے اپنے دعوے ‏— سب لاف و گزاف تھے زبانی؟
کیا مہر و وفا کے اپنے وعدے ‏— تھے مکر و ریا کی ترجمانی؟
کیا لطف و کرم کی ہر روایت ‏— جھوٹا قصہ تھی یا کہانی؟
اِخلاصِ بہم کی ہر حکایت ‏— تھی بغض و عناد کی نشانی؟
اے خاکِ وطن ہوں اس پہ نادم ‏— کی میں نے جو تیری مدح خوانی
حیرت ترے حال پر ہے دل کو ‏— رخصت ہوئی طبع کی روانی
آتا ہے زباں پہ اب تو یہ شعر ‏— آئینۂ شکوۂ نہانی

پنجاب کی آبرو پہ پھیرا
آپس کی لڑائیوں نے پانی

راولپنڈی — جنوری ۱۵ء

انگریز کے ارادے

ہندوستان چھوڑنے سے پہلے

ابھی ہے اِس میں جاں، گو نیم جاں ہے
ابھی یہ صاحبِ تاب و تواں ہے

ابھی اس کی زبانِ شکوۂ جَور
جو کُھلتی ہے تو کُھل جاتی ہے بےطَور

نہ ہوتا خوں اگر اس کے جگر میں
ہوائے حرّیت ہوتی نہ سر میں

ابھی تک یہ ہوا سر میں بھری ہے
ابھی اس کو جنُونِ برتری ہے

زباں پر نالہ و فریاد بھی ہے
پُرانی عظمتوں کی یاد بھی ہے

ابھی باقی ہے خوں اس میں، نہ چھوڑو!
نچوڑو، اور بھی اِس کو نچوڑو

صبحِ ہند

پیدا اُفقِ ہند سے ہیں صُبح کے آثار
ہے منزلِ آخر میں غُلامی کی شبِ تار
آمد سحرِ نَو کی مبارک ہو وطن کو
پامالِ محن کو!
مشرق میں ضیا ریز ہوا صُبح کا تارا
فرخندہ و تابندہ و جاں بخش و دل آرا
روشن ہوئے جاتے ہیں در و بامِ وطن کے
زندانِ کُہن کے!

"جے ہند" کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے
"جے ہند" کی عالم میں صدا گونج رہی ہے
یہ وَلولہ یہ جوش یہ طوفان مبارک
ہر آن مبارک!

اہلِ وَطن! آپس میں اُلجھنے کا نہیں وقت
ایسا نہ ہو غفلت میں گزر جائے کہیں وقت
لازم ہے کہ منزل کے نشاں پر ہوں نگاہیں
پُر پیچ ہیں راہیں!

وہ سامنے آزادی کامل کا نشاں ہے
مقصود وہی ہے، وہی منزل کا نشاں ہے
درکار ہے ہمت کا سہارا کوئی دم اور
دو چار قدم اور!

دُعائیہ گیت

توفیق مجھ کو میرے خُدا ہو عطا کہ میں
جان اور دل سے خدمتِ اہلِ وطن کروں
جب آئے کوئی تازہ مصیبت تو جھیل لوں
ہرگز نہ مَیں شکایتِ چرخِ کُہن کروں
جس پر ہو ناز میرے وطن، میری قوم کو
شیوہ وہ اختیار کروں، وہ چلن کروں
خُونِ جگر سے نخلِ وفا کو کروں نہال
پھُولوں سے اُس کے اپنے وطن کو چمن کروں
تھا نازشِ جہاں کبھی پیارا وطن مرا
اب کیوں نہیں ہے پھر اسے فخرِ زمن کروں!

قطعات

قوم اور وطن

ہر ایک قوم ہے اپنے وطن سے وابستہ
ہیں جس طرح گُل و بُلبل چمن سے وابستہ
وطن بغیر خیالی ہے قوم کی ہستی
ظہورِ جانِ گرامی ہے تن سے وابستہ

گفتار و کردار

بابو سریندر ناتھ گرجتے تھے مثلِ شیر
جس دور میں تھی حُبِّ وطن اک زباں کی بات
ٹوٹے فصاحت اور بلاغت کے سب طلسم
گاندھی نے آکے چھیڑ دی جب امتحاں کی بات

اکسٹریمسٹ اور ماڈریٹ

کچھ عرصہ پہلے اکسٹریمسٹ تھے جو لوگ
اب گردشِ زمانہ سے وہ ماڈریٹ ہیں
فطرت کے برخلاف ہے یہ ارتقا، مگر
پہلے وطن کا دل تھے، وہ اب محض پیٹ ہیں

نیا دور

ہر عہد میں حرام رہی مے کشی، مگر
اس عہد میں ممانعتِ مے حرام ہے
مقصد حضور کا نہیں آتا سمجھ میں کچھ
حامی اُسی کے آپ ہیں جو شے حرام ہے

محبّانِ وطن کی گرفتاری پر

سرزمینِ ہند میں اب شہر و ویرانہ ہے ایک
فخرِ آبادی جو تھے نظروں سے پنہاں ہو گئے
انقلابِ دہر نے کیسا دکھایا ہے یہ دور
شہر ویراں ہو گئے، آباد زنداں ہو گئے

شہیدانِ جلیانوالہ

ستم کشانِ وطن اب وہ وقت آ پہنچا
کہ دل ہو وقفِ الم، لب رہینِ نالہ رہے
نصیبِ گل کو ہو جب تک کہ چاکِ دامانی
چمن میں سوختہ جب تک درونِ لالہ رہے
دلوں میں یاد رہے کشتگانِ ہجرت کی
جگر میں داغِ شہیدانِ جلیانوالہ رہے

شہیدانِ وطن

سحر و شام دکھاتا ہے فلک رنگِ شفق
کہ تجھے خونِ شہیدانِ وطن یاد رہے
فرحت افشاں وہ سبک رُوح رہے مثلِ شمیم
گرچہ خود گُلشنِ آفاق میں برباد رہے
حلقۂ دام سے مرغانِ ہوا چھوٹ گئے
ہاتھ ملتے غم و اندوہ میں صیّاد رہے

سنگھٹن اور تنظیم

سنگھٹن اِدھر سے ہو رہا ہے — تنظیم اُدھر سے ہو رہی ہے
بھارت ماتا، غریب، بیکس — اپنی قسمت کو رو رہی ہے

قفس یا وطن

اَفسُردہ ہے دل بہار میں بھی
تاراجِ خزاں چمن ہے اپنا
بُلبُل ہے ترانہ سنج تو کیا
نالاں ہر مُوئے تن ہے اپنا
اے ابرِ بہار تو بھی رو لے
ہمدردِ غم و محن ہے اپنا
دم گھُٹنے میں کیا کسر ہے باقی
مانندِ قفس وطن ہے اپنا

بُزرگانِ سَلَف اور ہم

(ترجمہ از انگریزی)

ہمارے اَجداد جو مدبّر تھے اور مالک تھے بحر و بر کے
زمانے بھر میں وہ مُقتدر تھے، جہاں میں تھا حکمِ عام ان کا
جسے وہ جب چاہتے اُٹھاتے، جسے جہاں چاہتے گراتے
اَہم فرائض ہے نام جن کا، وہ کرتے خود انتظام ان کا
مگر یہ ہم ہیں کہ کرچکے ہیں حقوقِ خاکِ وطن کو زائل
کریں گی کیا فخر اپنی نسلیں، ڈبو دیا ہم نے نام اُن کا
ہوئے ہیں اہلِ وطن گداگر نہیں ہے پوشیدہ حالِ اَبتر
ابھی مگر جستجوئے تفریح میں ہے سودائے خام اُن کا

ایضاً

ہمارے ہی بزرگانِ سلف تھے — بلاکش، نفس کُش، ایثار پیکر
ہوئے ہم ننگِ ملت، وائے افسوس — تن آساں، خود غرض اور نفس پرور
جہاں انوار سے تھا اُن کے روشن
ہمارا حال ہے روشن جہاں پر

بھگت سنگھ زندہ باد

بابِ قبول بند رہا، اہلِ ہند نے
مانگی بہت دعا کہ، بھگت سنگھ زندہ باد
مایوس بارگاہِ رعونت سے آ گئی
گاندھی کی التجا کہ، بھگت سنگھ زندہ باد
پنجاب کی فضاؤں سے محروم آج تک
آتی ہے یہ صدا کہ بھگت سنگھ زندہ باد!

دِل اور زبان

کل میکدے میں پُوچھا پیرِ مغاں سے مَیں نے
بُت خانہ اور مسجد نزدیک ہیں یہاں سے
گُلبانگ میکشوں کی، رِندوں کا شور و غوغا
ہے گونجتا فضا میں ٹکرا کے آسماں سے
مسجد کے سجدہ آرا، بُت خانے کے پجاری
چِڑتے نہیں ذرا بھی غوغائے میکشاں سے
ہو جاتے ہیں وہ لیکن باہم چُھری کٹاری
ناقوس کی صدا سے، آوازۂ اذاں سے

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا"

یہ خود سُنا ہے میں نے اقبالِ خوش بیاں سے
یہ لوگ اس حقیقت سے آشنا نہیں ہیں
یا سہو ہو گئی ہے فطرت کے ترجماں سے
رُوداد سن کے میری وہ پیرِ مرد بولا
آئینِ وعظ و حکمت ہے دُور اس مکاں سے
کہتا ہوں تجھ سے لیکن رندوں کا ایک نکتہ
جو سر بہ سر ہے عاری آرائشِ بیاں سے
دل میں ہو یا عمل میں، مذہب ہے امنِ عالم
یکسر فساد، اگر ہو ظاہر فقط زباں سے

منزل

حصولِ آزادی کے بعد

پاکستان کو اَلوداع

رُباعی

آج اپنے وطن سے جا رہا ہے محروم ۔ ما من پیشِ نظر، نہ منزل معلوم
ہنگامِ وداع ہم نے دیکھا اس کو ۔ حسرت زدہ، دل شکستہ، حیراں مغموم

نظم

اے مرے پیارے وطن، میرے بزرگوں کے وطن
اَے مری راحت کی دُنیا، اے مرے اچھے وطن
عُمر بھر تیری وفاداری کا دم بھرتا رہا
مدح تیری شعر میں زیبِ رقم کرتا رہا
مشغلہ میرا رہا علم و ادب شعر و سخن
اور سمجھا میں اسی کو خدمتِ اہلِ وطن
حرصِ دنیا سے رہا یک سو دلِ دانش پذیر
ننگِ تن میرے لئے تھا ذوقِ دیبا و حریر

تُو نے لیکن اے وطن، مجھ کو دیا انعام خُوب
زندگی کے دورِ آخر میں ہوا انجام خوب
آہٹ آزادی کی پا کر ہو گیا دیوانہ تُو
آدمیّت کی فضیلت سے ہوا بیگانہ تُو
ہو گیا رقصِ جُنوں میں آہ! کتنا بے خبر
جامۂ تہذیب پھینکا تن سے اپنے پھاڑ کر
لیگ، کا یومِ عمل بنگال سے آیا یہاں
ساتھ اپنے محشرستانِ ستم لایا یہاں
نام پر مذہب کے ہر فعلِ زبُوں ہونے لگا
گرم بازارِ فساد و کُشت و خُوں ہونے لگا
یک بہ یک آبادیوں سے آگ کے شُعلے اُٹھے
خُون کے پیاسوں کے لشکر قریہ قریہ سے اُٹھے
جو تصوّر میں نہ تھے، فتنے وہ برپا ہو گئے
چار سُو شمشیر و خنجر کار فرما ہو گئے
حق سے بے رُخ کر دیا انگریز کی تدبیر نے
آدمی سے آدمیّت چھین لی تقدیر نے

نام کیا بدلا ترا، بدلا نظامِ زندگی
غیر مسلم ہو گئے آتش بجامِ زندگی

آگ دکھلا دی اُنھیں، بننے لگا یوں پاک تو
اپنے آنگن میں اُنھیں سمجھا خس و خاشاک تو

کوچہ و بازار سب ویران ہو کر رہ گئے
گھر مکینوں کے لیے شمشان ہو کر رہ گئے

عورتوں کی عصمت اور بچوں کی جانِ پاک پر
وہ ستم ٹوٹے کہ فریادیں گئیں افلاک پر

محشر آرائی سے تیری جو ستم کش بچ گئے
بے سر و ساماں وہ نکلے ڈھونڈنے کو گھر نئے

اُن میں شامل ہے مرا نورِ نظر آزاد بھی
تجھ سے کوسوں دُور دہلی میں اماں جس کو ملی

اس کے نغمے بھی ہوئے تیری فضاؤں پر گراں
کس لئے تو ہو گیا اس درجہ ہم سے سرگراں

ہم نے یہ مانا ترے اپنے سخنور کم نہیں
اپنے جانے سے تری بزمِ سخن برہم نہیں

ہم بھی تیرے ہی نواسنجِ چمن تھے اے وطن
عندلیبِ نغمۂ حُبِّ وطن تھے اے وطن

اتحادِ ہندو و مسلم کے ہم خواہاں رہے
تیری بے انصافیوں پر بھی وفا پیماں رہے

تیری آزادی کے صدقے میں ہمیں ہجرت ملی
جذبۂ ذوقِ وفا کی ہم کو یہ قیمت ملی

الوداع اے ارضِ پاکستاں ہمیشہ کے لئے
یاد رکھیں گے ترے احساں ہمیشہ کے لئے

جائے سامانِ معیشت داغِ حسرت لے چلے
سبزۂ بیگانہ تھے ہم تیرے گلشن سے چلے

دیکھئے کیا رنگ ہو آگے تری تاریخ کا
خُونِ ناحق سے ہے پہلا باب تو لکھا گیا

تُو پھلے پھُولے، رہے تجھ پر کرم اللہ کا
دُور دامن سے ترے شُعلہ ہماری آہ کا

تو ہوا دشمن ہمارا، ہم ترے دشمن نہ تھے
تُو ہوا کیوں ہم سے بدظن، تجھ سے ہم بدظن نہ تھے

غلط

اب بھی ہیں آباد تجھ میں اپنے پیارے سینکڑوں
جاننے پہچاننے والے ہمارے سینکڑوں
جو مسلماں ہیں مگر کہتے نہ تھے کافر ہمیں
اپنی مجلس میں بٹھاتے تھے وہ آنکھوں پر ہمیں
آہ! ایسے مخلصوں سے بھی جُدا ہونا پڑا
وہ وفا پرور تھے، ہم کو بے وفا ہونا پڑا
داغ ہیں اُن کی جُدائی کے دلِ غمناک میں
بعدِ مُردن بھی رہیں گے جو ہماری خاک میں
ہم بُرا چاہیں ترا ممکن نہیں، ممکن نہیں!
تیرے حق میں بددُعا ممکن نہیں، ممکن نہیں!
یہ دُعا مانگا کریں گے ہم خدائے پاک سے
جوہرِ انسانیت چمکائے تیری خاک سے
ناروا داری کا کانٹا تیرے گلشن میں نہ ہو
اور تعصّب کی نجاست تیرے دامن میں نہ ہو
خیر سے تجھ کو محبت اور شر سے عار ہو
تاکہ پاکستان کہلانے کا تُو حقدار ہو!

عتابِ وطن

ہوئی خشمگیں ارضِ پاکِ وطن   لگی کہنے یوں مجھ سے خاکِ وطن
کہ اے نغمہ پردازِ دورِ کہن   شکستہ ہوا سازِ دورِ کہن
نہیں ہے ضرورت تری اب یہاں   روانہ ہو تو سوئے ہندوستاں
نہ تھی مجھ کو ہرگز امیدِ عتاب   دیا سر جھکا کر یہ میں نے جواب

"چو بدلِ تو کردم جوانیِ خویش
بہ ہنگامِ پیری مرانم زپیش"

یہ سن کر ہوئی نرم، اور یوں کہا   کہ اے شاعرِ نکتہ رس، خوش نوا
تری ذات مجھ پر نہیں کچھ گراں   مگر اک قیامت ہے برپا یہاں

ہے منظور مجھ کو حفاظت تری
بچائے گی اب تجھ کو ہجرت تری!

صوفی اللہ داد خاں

اگست اور ستمبر ۱۹۴۷ء کے مہینوں میں جب مغربی پنجاب جہنم کا شعلۂ زار بنا ہوا تھا کئی ایسے واقعات بھی دیکھنے اور سننے میں آئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ کہیں کہیں انسانی ہمدردی اور شرافت کے پودے اس جلتے ہوئے باغ میں ابھی تک لہلہا رہے ہیں۔ عیسیٰ خیل دریائے سندھ کے مغربی کنارے ضلع میانوالی کی تحصیل ہے۔ اور یہ پنجاب کا آخری قصبہ ہے۔ ایک ایم، ایل، اے نے اس تحصیل میں اپنی آتشیں تقریروں سے کئی ماہ تک نفرت کی آگ بھڑکائی۔ اوّل اوّل تو اس کا کچھ اثر نہ ہوا لیکن ستمبر میں فسادی عنصر امن پسند طاقتوں پر غالب آگیا اور ۱۳ ستمبر کو صبح ۸ بجے غنڈوں نے بازار کو آگ لگا دی اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ آدھا بازار جل گیا۔ جامع مسجد کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ صوفی اللہ داد خاں مسجد کی حالت کا جائزہ لینے آئے۔ کچھ ہندو اُن سے طالبِ امداد ہوئے۔ انھوں نے نہایت فراخدلی سے امداد کا وعدہ کیا اور قریباً ایک سو مرد عورتوں اور بچوں کو اسی وقت اپنے مکان پر لے گئے اور ان کے کھانے پینے کا سامان مہیا کر دیا۔ جب تک ہند سرکار کی طرف سے عیسیٰ خیل کے ہندوؤں کو نکالنے کا بندوبست نہ ہوا صوفی صاحب ہر طرح سے اُن کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ چند اور فراخ دل اور روشن خیال مسلمان بھی اس کارِ خیر میں اُن کے ممد رہے۔ جن میں مسٹر غلام محمد ہاشمی اور خان غالب داد خاں نائب ڈپٹی کمشنر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ عیسیٰ خیل سے آنے والوں میں جالندھر اور دہلی میں مجھ سے جو بھی ملا اُس کی زبان پر صوفی اللہ داد خاں کا نام تھا۔ میرا دل بھی ہم وطنی کے تعلق سے صوفی صاحب کے متعلق شکر گزاری کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ ان چند اشعار میں اسی شکر گزاری کا ناکافی اظہار ہے۔

بے بسوں کی جو تو نے کی امداد
عمر بھر گیت تیرے گائیں گے
یاد تیری بسائیں گے دل میں
خانہ ویراں جہاں بھی جائیں گے

بے گناہوں کے خون کی پیاسی — گولیاں، خنجر، آگ، تلواریں
بے مددگار و یار، اقلیت — اکثریت کی اُس پہ یلغاریں

نظر آتی تھیں صاف آنکھیں اپنی — گلی کوچوں میں بے کفن لاشیں
سچ اگر پوچھیے تو جیتے جی — بن رہے تھے وہ خستہ تن لاشیں

گھر رہے حشر تک ترا آباد — جس میں اُن کو پناہ دی تُو نے
جُرأتِ بے پناہ سے بخشی — مرنے والوں کو زندگی تُو نے

اِس سے بڑھ کر ثواب کیا ہوگا — خوش رکھے ربِّ دوجہاں تجھ کو
اجر دے گا وہی کریم اس کا — صوفی اللہ داد خاں تجھ کو

پاکستان

پروفیسر تلوک چند محروم راولپنڈی سے نقل مکانی کرکے دہلی پہنچ چکے ہیں اور "تیج" ویکلی کے ایڈیٹر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ دہلی پہونچ کر آپ نے پاکستان پر ایک استفہامیہ نظم کہی ہے۔ جسے ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔ پاکستانی عوام اور رہنماؤں کو سوچنا چاہیئے کہ اس نظم کا جواب کیا ہے؟ (ادارہ)

ساکنانِ دیارِ پاکستاں ... مجھ کو بتلاؤ از رہِ ایماں
کیا وہاں کوئی بھی گناہ نہیں؟ ... ہرگز اس میں بدی کو راہ نہیں؟
جھوٹ ہے اس میں اور نہ چوری ہے؟ ... جبر ہے اور نہ سینہ زوری ہے؟
نہ ہوس ہے، نہ زر پرستی ہے؟ ... میکدے میں وہاں نہ مستی ہے؟
اُٹھ گیا واں سے حسنِ بازاری؟ ... بند ہے اس کی یا خریداری؟
ننگ و ناموس ہے وہاں محفوظ؟ ... ہر خطر سے ہے مال و جاں محفوظ؟
قتل و غارت کا اب نشاں ہی نہیں؟ ... وہ زمیں اور وہ آسماں ہی نہیں؟
کوئی دھوکا وہاں نہیں ہوتا؟ ... کچھ کسی کا زیاں نہیں ہوتا؟

ہے نہ غیبت وہاں نہ بدگوئی؟ فتنہ ہوتا نہیں بپا کوئی؟
بدزبانی ہے اور نہ بدکاری؟ مکر و حیلہ ہے اور نہ عیاری؟
بدسگالی ہے اور نہ بدبینی؟ نہ عمل میں کوئی بد آئینی؟
دل ہیں بغض و حسد سے سب خالی؟ مرتبہ ہے ضمیر کا عالی؟
پاک کینوں سے ہو گئے سینے؟ جتنے پتھر تھے سب ہیں آئینے؟
لینا دینا ہے بند رشوت کا؟ مٹ گیا نام کبر و نخوت کا؟
نہیں ابلیس کا گزر اس میں؟ خود ہے اللہ دادگر اس میں؟
یوں اگر ہے تو ہے وہ پاکستان بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس کی شان

ورنہ سارا جہاں کہے گا ضرور!
ایک زنگی کا نام تھا کافور!

"احسان" لاہور

۲۱ جنوری ۱۹۴۸ء

سلام

بھارت ماتا! تجھ پہ سلام
کرتے ہیں جُھک کر پرنام

تیری شوکت، تیرا مان   اپنا دھرم، اپنا ایمان
تیری عزّت پر قربان   اپنا تن من، اپنی جان

بھارت ماتا! تجھ پہ سلام
کرتے ہیں جُھک کر پرنام

امن و اماں پیغام ترا   اَمرت سے پُر جام ترا
سُر جائے، ہو کام ترا   روشن کرلیں نام ترا

بھارت ماتا، تجھ پہ سلام
کرتے ہیں جھک کر پرنام

دریا اور کہسار ترے　　جنگل اور گلزار ترے
بادل گوہر بار ترے　　راحت کے انبار ترے

بھارت ماتا تجھ پہ سلام
کرتے ہیں جھک کر پرنام

کٹ تو گئی زنجیر تری　　اور بڑھے توقیر تری
چمکی ہے تقدیر تری　　پھیلے گی تنویر تری

بھارت ماتا تجھ پہ سلام
کرتے ہیں جھک کر پرنام

نوروزِ ہند

گُل بداماں ہے چمن زار نظامِ نَو کا
کشورِ ہند کا نو روز ہے یہ روزِ سعید
آنکھیں پُرنُور ہیں، دل اہلِ وطن کے مسرور
کہ ہوئی صُبحِ وطن مطلعِ انوارِ اُمید
جس نے نعمت ہمیں بخشی ہے یہ آزادی کی
اُس کے الطافِ کریمانہ سے کب ہے یہ بعید
کہ رہِ راست پہ لے آئے وہ گمراہوں کو
ہیں جو بالطبع ابھی پیرِ کلیسا کے مُرید

فرقہ واری پہ ہیں دل آج بھی جن کے مائل
یا جو کرتے ہیں تشدّد کے عمل کی تائید
میکشوں کو وہ ہتی جام رکھے گا کب تک
جس نے دی ہے درِ میخانۂ عشرت کی کلید
نئی تقدیر کا سانچہ ہو ترا ہر ذرّہ
ہو مبارک تجھے اے خاکِ وطن دَورِ جدید
آرزوؤں کی بر آئی ہیں مُرادیں افسوس
آبرو پہ جو تری ہو گئے مردانہ شہید
دلِ پُر شوق ہوا فال کا جویا تو وہیں
گوشِ مشتاق میں آئی یہ فرح بخش نوید
"للّٰہ الحمد ہر آن چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد زِ پسِ پردۂ اسرار پدید"

آزادی

فضا کی آبرو ہے پرچمِ گردوں وقار اپنا
کہ ہے اس دور کی آزاد قوموں میں شمار اپنا

غلامی اور ناکامی کا دورِ ابتلا گزرا
مساعد بخت ہے اب اور حامی روزگار اپنا

چھٹے دامن سے اپنے داغہائے ننگِ محکومی
وطن اپنا ہے، اپنی سلطنت ہے، اقتدار اپنا

نہ گلچیں غیر ہے کوئی، نہ ہے صیاد کا کھٹکا
چمن اپنا ہے، اپنے باغباں، لطفِ بہار اپنا

اب، اے اہلِ وطن! اس کو بگاڑیں یا بنائیں ہم
مقدر پر ہے اپنے ہم کو حاصل اختیار اپنا

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا

تھا فرنگی کا احتشام بڑا　　وہ شکاری تھا با نظام بڑا
ہند تھا صید زیرِ دام بڑا　　اب ہے آزاد وہ غلام بڑا

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا
کیوں نہ ہو کانگرس کا نام بڑا

توڑ کر دامِ شوکتِ انگریز　　ختم کر دی حکومتِ انگریز
ہوئی کافور دہشتِ انگریز　　عید تھی اپنی رخصتِ انگریز

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا
کیوں نہ ہو کانگرس کا نام بڑا

ملک دو سو برس سے تھا محکوم   دست و پا بستہ، عاجز و مظلوم
کانگرس نے بدل دیا مقسوم   کیوں نہ آفاق میں ہو اس کی دھوم

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا
کیوں نہ ہو کانگرس کا نام بڑا

تھا مسلح حریف کینہ شعار   اور اہنسا کی یہ علم بردار
جنگ کرتی رہی ہے بے ہتھیار   حق نے دی اس کو فتح آخرکار

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا
کیوں نہ ہو کانگرس کا نام بڑا

راہرو بھی رہی ہے، رہبر بھی   مثلِ انجم بھی نور گستر بھی
خستہ جاں، دردمند و مضطر بھی   چارہ ساز و غریب پرور بھی

کانگرس نے کیا ہے کام بڑا
کیوں نہ ہو کانگرس کا نام بڑا

اہنسا کے سپاہی

کشورِ ہند کو آزاد کرانے والے
پلٹنوں کے تھے سپاہی، نہ رسالوں کے سوار
تھے وہ پابند اہنسا کے، نہتّے انساں
دوست ہر ایک کے اور دشمنِ رسمِ آزار
گامزن اس پہ رہے صبر و تحمّل کے ساتھ
اُن کو گاندھی نے دکھائی تھی جو راہِ دشوار
شیوۂ امن و اماں، مسلکِ تسلیم و رضا
کاربند اس پہ رہے اور نہ جھجکے زنہار
چین لینے نہ دیا اُن کو زمانے نے کبھی
قہرِ انگریز کا ہوتے رہے اکثر وہ شکار

پا بہ زنجیر کبھی تا درِ زنداں پہنچے
اور کبھی گھر میں نظر بند بحکمِ سرکار

گولیوں کی کبھی سر پر ہوئی اُن کے بارش
گالیوں میں کبھی نکلا دلِ حاکم کا غبار

رُفقا اُن کے وہ جانباز، شہیدانِ وطن
جو ہوئے دار و رسن سے دمِ تعزیر دوچار

پھر غضب یہ کہ شریکِ ستم و جور رہے
اپنے ہی اہلِ وطن یعنی وطن کے غدّار

متزلزل نہ ہوئے اُن کے قدم صورتِ کوہ
حملے گو با دِ حوادث نے کیے سلسلہ وار

شمع تھی حُبِّ وطن کی جو وطن میں روشن
اُس پہ ہوتے ہی رہے صورتِ پروانہ نثار

آخرِ کار ہوئی فتح و ظفر اُن کو نصیب
مان لی شوکتِ شاہانہٗ انگریز نے ہار

اُن کی جاں کاہ ریاضت ہی کا ثمرہ ہے یہ
کہ پھر اس اُجڑے ہوئے باغ میں آئی ہے بہار!

مئی ۱۹۴۸ء

ہمارے سپاہی

کم نوش، سرفروش، سلحپوش، سخت کوش
ان سا جہاں میں اور سپاہی نہیں کوئی
آ کر بہ عزمِ جنگ صف آرا ہو سامنے
دشمن کی اس سے بڑھ کے تباہی نہیں کوئی

جس معرکے میں جائیں گے لے کر خدا کا نام
دشمن کو خاک و خوں میں ملا کر ہی آئیں گے
کوہِ گراں بھی راہ میں آجائے گا اگر
گرد اُس کی ٹھوکروں سے اُڑا کر دکھائیں گے

ہر چند کُشت و خوں سے انھیں احتراز ہے
بُزدل نہ جانئے گا جوانانِ ہند کو
ہیں مادرِ وطن کے یہ فرزند جاں نثار
جان سے عزیز جانتے ہیں شانِ ہند کو

صبر ہمارا جیت گیا

اُس وقت کو یاد نہ کر ہمدم، جب دُور ہماری منزل تھی
تاریک تھیں جب راہیں ساری، بے نُور ہماری منزل تھی
جب قافلۂ ابنائے وطن سو بار گھرا طوفانوں میں
پر عزمِ صمیم سے اپنے وہ ہرگز نہ پھرا طوفانوں میں
دامانِ ابد سے وابستہ پُرپیچ غلامی کی وادی
تھے دُور تصوّر کی حد سے انوارِ فضائے آزادی
سالار رہوئے قرباں کتنے اس محکومی کی گھاٹی میں
کتنے ہی لعل ملے اپنے اس مظلومی کی ماٹی میں
گزرے ہر او گھٹ گھاٹی سے ہر سنگِ گراں کو چُور کیا
جب راہ میں خون کے دریا بھی آئے تو اُن کو عبُور کیا

کیا اُونچی کالی سر بہ فلک دیواریں تھیں زندانوں کی
سائے میں جن کے گھلتی تھی جاں گھُٹ گھُٹ کر ارمانوں کی
اُف سناٹے میں راتوں کے وہ جھنکاریں زنجیروں کی
وہ اوجِ فلک پر جا جا کر جو یا آہیں تاثیروں کی
پُرہَول غلامی کی وادی اور پیٹھ پہ کوڑے آقا کے
گلزار تھی راہ شوق اپنی چھینٹوں سے خونِ تمنّا کے
گو دار و رسن کے ہنگاموں کا گرم بہت بازار رہا
اور آقائی کے زور میں آقا مائلِ صد آزار رہا
پُرذوق ستم نے اس کے آخر خود اُس کو بدنام کیا
بے کار گئی تدبیر اس کی تقدیر نے اپنا کام کیا
اس وقت کو ہمدم یاد نہ کر، وہ دورِ غلامی بیت گیا
جب جور و ستم سب ہار گئے اور صبر ہمارا جیت گیا
لیکن اِس بات کو بھُول نہ جا اے ساکنِ منزلِ آزادی
غفلت سے تری نذرِ طوفاں ہو جائے نہ ساحلِ آزادی

جشنِ آزادی

صبا پھر لے کے آئی ہے پیامِ جشنِ آزادی
ہے گلزارِ وطن میں اہتمامِ جشنِ آزادی

یہ جلسے، یہ چراغاں، یہ سُرور و نُور کا عالم
ہے صبحِ جنّت الفردوس، شامِ جشنِ آزادی

ہوئی سامانِ تسکیں معبدوں میں وہ دُعا بن کر
جو رونق میکدوں میں ہے بنامِ جشنِ آزادی

نظامِ جشنِ آزادی سے اے رُوٹھے ہوؤ، دیکھو
ہے دستِ خاصِ نہرو میں نظامِ جشنِ آزادی

اِسی دن کے لئے قرباں کئے بیٹھے تھے جو سب کچھ
دلِ احرار سے پوچھو مقامِ جشنِ آزادی

کہاں خوشنودیٔ اغیار کے مجبور ہنگامے
کہاں جمہوریت کا اِحتشامِ جشنِ آزادی

وطن کے تشنہ کاموں کو صلائے عام دے ساقی
کہ پھر گردش میں ہے کاس الکرامِ جشنِ آزادی

شاعر اور آزادی

شاعر

کر کے طے ہر ہفت خوانِ امتحاں تیرے لئے
مضطرب تھے کب سے اے جانِ جہاں تیرے لئے
اے وقارِ زندگی، اے نو بہارِ زندگی!
ہم نے دیکھے ہیں بہت جورِ خزاں تیرے لئے
سر بکف تھے، جاں بلب تھے، پیکرِ ایثار تھے
ساکنانِ کشورِ ہندوستاں تیرے لئے

وقفِ زنداں بھی ہوئے، دار و رسن کی نذر بھی
ہو گئے برباد کتنے خانداں تیرے لئے

نو عروسانِ وطن کے لٹ گئے کتنے سہاگ
مر گئے بے وقت کتنے نوجواں تیرے لئے

دل بھی چھلنی ہیں، جگر بھی، آج تک ماں باپ کے
بے زباں بچوں نے کھائیں گولیاں تیرے لئے

شاعرانِ خوش نوا کے نغمہ ہائے دل نواز
لب تک آتے تھے بہ اندازِ فغاں تیرے لئے

آ گئی آخر یہاں تو، گرچہ بعدِ انتظار
دل ترے مقدم پہ قرباں، نذر جاں تیرے لئے

تجھ پہ، لیکن اے شبِ تارِ جوانی کی سحر
کس لئے ہے آج تک غالب دھندلکوں کا اثر

آزادی

ٹھوکریں کھاتی بحالِ زار و مضطر آئی ہوں
کیا کہوں کن مشکلوں سے میں گزر کر آئی ہوں

زخم جو کھائے تھے تم نے، وہ مرے تن پر لگے
خارزاروں سے یہاں مثلِ گُلِ تر آئی ہوں

سو برس پہلے کیا تھا عزم جو تم نے اسے
راہبر اپنا بہ رنگِ نو بنا کر آئی ہوں

تم نے استقبال میرا قتل و غارت سے کیا
گرچہ میں بے منّتِ شمشیر و خنجر آئی ہوں

جانتے ہو کس قدر دشوار تھا آنا مرا
جانتے ہو تم کہ کس حیلے سے کیوں کر آئی ہوں

برکتیں اپنی نہیں لائی ہوں اپنے ساتھ میں
اس لئے گویا نہ آنے کے برابر آئی ہوں

کیا یہی کم ہے کہ میں نے پا لیا ہے پھر تمھیں
کیا یہ مُبہم ہے کہ میں تم کو میسّر آئی ہوں

دولتِ جاوید ہوں میں مجھ کو اپناؤ اگر
کب یہ کہتی ہوں کہ لے کر لعل و گوہر آئی ہوں

مالک و مختار اب اپنے مقدّر کے ہو تم
شکوہ کس کا ہے تمھیں، کس کا گلہ کرتے ہو تم؟

زلزلے اور طوفان

زلزلوں سے اور طوفانوں سے ہیبت ناک تر
تھا غلامی کا سفر، ہم جس کو کر آئے ہیں طے
قطرۂ اشکِ فلک ہے، جس کو طوفاں کہہ دیا
ہے زمیں کے دل کی دھڑکن، زلزلہ کیا چیز ہے
ہاں، مگر کیوں آسماں روتا ہے یوں زار و قطار
کس لئے چھاتی دھڑکتی ہے زمیں کی پے بہ پے
شاعرانہ ہے جواب اس کا، مگر شایانِ غور!
لب نہیں کھلتے ہیں شاعر کے کبھی بے علمِ شے
آسماں روئے گا ہم پر اور لرزے گی زمیں
دل میں جب تک کھوٹ ہے اور لب پہ ہے بھارت کی جے
خود غرض کے نعرۂ "جے ہند" میں ہو کیا اثر
کرشن کی بنسی نہیں ہوتی ہر اک بوسیدہ نے!

مقامِ شکر

تنگیِ کاشانہ کیوں ہے باعثِ افسردگی
یہ زمیں تیرے لئے، یہ آسماں تیرے لئے
رودِ جمنا کے کناروں کی فضائے دلنشیں
محوِ رقصِ ناز ہر موجِ رواں تیرے لئے
تیری خاطر ہے بپا ہر کُنج میں بزمِ نشاط
وقفِ زیر و بم طیورِ نغمہ خواں تیرے لئے
دُھوپ غربت کی اگر ہے باعثِ آزردگی
ہر شجر تانے ہوئے ہے سائباں تیرے لئے
ہے اگر تیرے مقدّر میں بلندی عزم کی
جادۂ روشن ہے نقشِ کہکشاں تیرے لئے
اور اگر تُو ہے رہینِ پستیٔ ہمت، تو ہے
فرشِ راحت سبزۂ دامن کشاں تیرے لئے
اَے دلِ ناداں! مقامِ شکر ہے شکووں کو چھوڑ
مِل نہیں سکتا جو دہلی میں مکاں تیرے لئے!

دوستوں کی موت پر شادمانی

مارچ سینتالیس سے پہلے جو اپنے مہرباں
ہو گئے رخصت جہاں سے جانبِ دارالاماں
بسکہ تھی اُن کی جدائی باعثِ دردِ نہاں!
فرطِ غم سے اُن کے مرنے پر ہوئے ہم نوحہ خواں
لیکن اب اُن دوستوں کی موت پر شاداں ہیں ہم
اور اپنے زندہ رہ جانے پہ اشک افشاں ہیں ہم
اپنی آنکھوں نے جو دیکھے فتنہ ہائے انقلاب
اپنے کانوں نے سنا جو ماجرائے انقلاب
آہ! جو نازل ہوئی ہم پر بلائے انقلاب
جس طرح ہم پہ ہوئی مشقِ جفائے انقلاب
مرنے والے جان دے کر اس سے مصئوں ہو گئے
زندگی سے کیا ملا؟ زندوں کے دل خوں ہو گئے!

بچ گئی کشتی

پھونک کر زہری فسوں، پھیلا گیا خونی جنوں
جاتے جاتے ساحرِ برطانیہ کیا کر گیا
آخری ٹھوکر سے ٹکڑے کر دیے اس مُلک کے
یا اُسی برتن کے، جس برتن میں خود کھا کر گیا
پھُوٹ کی "کل" سے حکومت کی دیا پیٹ بھر پر
جب چلا تو اور بھی کچھ اُس کو جلتا کر گیا
تھی محبّانِ وطن سے لاگ، اُن کے واسطے
گُتھیاں اُلجھا کے دردِ سر مہیا کر گیا
چار جانب آتشِ کین و حسد بھڑکا گیا
محشرِ جور و ستم ہر سمت برپا کر گیا
ہند کی کشتی کو چھوڑا ورطۂ آفات میں
ناخدائے بے مروّت خود کنارا کر گیا
جُز امیدِ رحمتِ باری دھرا تھا کیا یہاں
بچ گئی کشتی کہ تہ در سا کھویا تھا یہاں!

اہنسا کا پیغمبر

مہاتما گاندھی

تجھے پیدا کیا دورِ زوالِ آدمیت میں
کہ تجھ کو دیکھ کر انسان پہچانے مقام اپنا
عمل کی زندگی کو جب نہ دیکھا اہلِ غفلت نے
دیا اُن کو متاعِ زندگی دے کر پیام اپنا

ترا پیغام پیغامِ ازل تھا، یعنی انساں کو
کدورت اور نفرت ناروا ہے نوعِ انساں سے
یہی پیغام عیسیٰ اور گوتم لے کے آئے تھے
لیا اقرار نانک نے اسی کا اہلِ ایماں سے

اہنسا مسلکِ اہلِ صفا ہے روزِ اوّل سے
رہا ہے مشرق و مغرب کو دائم اتفاق اس پر
دِکھائی راہ سیدھی کج روانِ دھر کو تو نے
ہوئے مائل نہ لیکن عاشقانِ افتراق اس پر

بھٹکتا پھر رہا ہے دشتِ آتشناک میں انساں
لپک کر ہر طرف شعلوں سے شعلے آن ملتے ہیں
جہاں تو لے کے جانا چاہتا تھا آدمیت کو
وہاں صدق و صفا، مہر و وفا کے پھول کھلتے ہیں

ترے خونیں فسانے کو ہوا رنگِ بقا حاصل
رہے گا رہتی دنیا تک ترے ایثار کا چرچا
صفا کیشانِ عالم کے لئے تسکیں فزا ہوگا
تری جانِ وفا پرور، دلِ غمخوار کا چرچا

مہاتما گاندھی

ہادیِ امن و اماں تھا، پیکرِ ایثار تھا
ہند کی پیشینہ عظمت کا علم بردار تھا
گو فقیرِ بے نوا تھا عالمِ اسباب میں
سینہ تانے رُوبروئے سطوتِ اغیار تھا
جُھک گئی انگریز کی شوکت بھی اس کے سامنے
تھا اگر حربہ کوئی، پیکارِ بے آزار تھا
بہترین انسان دُنیا کا نہ یوں مانا گیا
فخرِ شانِ آدمیّت، سرورِ اَبرار تھا
عاملِ گیتا کروڑوں میں نہیں اس سا کوئی
ترکِ دنیا پر بھی وہ دنیا کا خدمتگار تھا
حق پسند و حق شعار و حق شناس و حق گزار
عُمر کے ہر مرحلے پر اُس کو حق سے پیار تھا

رہنمائی قوم کی درماندگی میں اُس نے کی
خودشناسی سے شناسائے رہِ دشوار تھا
منزلِ مقصودِ آزادی پہ لے آیا اسے
ملتِ مجبور کا وہ کارواں سالار تھا
کیوں نہ جاگ اُٹھتی تری تقدیر اے ہندوستاں
جبکہ تیرا راہبر اک مردِ شب بیدار تھا
رہبروں کو روشنی ملتی تھی اُس کی ذات سے
ہند میں گاندھی منارِ جلوۂ انوار تھا
وہ اہنسا کا پیمبر، شانتی کا دیوتا
یا مسیح اس دور کا، گوتم کا یا اوتار تھا
مار کر اس کو کسی کے ہاتھ آخر کیا لگا
قوم کے ماتھے پہ کالا داغ ہتیا کا لگا

تیرا لہو ٹپک کر جس خاک پر گرا ہے
لعل و گہر سے اُس کا ہر ذرہ اب سوا ہے

انعامِ امن

راج گھاٹ سے واپس آتے ہوئے

آسماں پر تُو ہے اے امن واماں کے دیوتا
گونج رہے ہیں عالمِ فانی میں تیرے نقشِ پا
زندگی از بسکہ تھی تیری ضیا گیرِ وفا
بعدِ مردن خاک سے پیدا ہے تنویرِ وفا
فاتحہ آ آ کے قُدسی پڑھتے ہیں اس خاک پر
روز گلہائے عقیدت چڑھتے ہیں اس خاک پر
مشرق و مغرب کی قوموں کے نمائندے تمام
پیش کرتے ہیں تجھے اپنا خراجِ احترام
سر جھکائے، ہاتھ جوڑے، آنکھ میں آنسو لئے
امنِ عالم کا دلوں میں جذبۂ دلجُو لئے
دل کو یاں عجز آشنا کرتے ہیں دنیا کے امیر
شاہزادے ہوں کہ شاہوں کے جہاندیدہ سفیر
بٹ رہا ہے ساحلِ جمنا سے آج انعامِ امن
پھیلتا جاتا ہے دنیا میں ترا پیغامِ امن!

وہ شہید آیا

ہمارے حق میں جس کی صبحِ نَو روزِ سعادت تھی
زہے قسمت! کہ پھر بھارت میں وہ روزِ سعید آیا
ہماری عید ہے، یا جنم دن ہے آج گاندھی کا،
وہ گاندھی بابِ آزادی کی جو لے کر کلید آیا
مسیحا بن کے جس نے رُوح پھُونکی مُردہ ملّت میں
جو خود بن کر مجسّم زندگانی کی نوید آیا
اہنسا سے کیا مغلوب استبداد کو جس نے
جو بن کر شافیِٔ آزارِ تہذیبِ جدید آیا
شبِ تارِ غلامی یاس خیز و وحشت افزا تھی
وہ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے شمعِ اُمید آیا
تصوّر میں مرے محروم اک تصویر ہے گویا
دوبارہ لوٹ کر اپنے وطن میں وہ شہید آیا

خیر مقدم

اکتوبر ۴۸ء میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کی خدمت میں اہلِ دہلی نے ایڈریس پیش کیا۔ یہ نظم اس تقریب میں پڑھی گئی۔

مرحبا، صد مرحبا، اے کارواں سالارِ قوم
اے عزیزِ قوم، فخرِ قوم، اے سردارِ قوم
نام تیرا باعثِ تجدیدِ اقبالِ وطن
ذات تیری دافعِ ہر صورتِ ادبارِ قوم
سربلندی عزم سے تیرے ملی ہے قوم کو
واقعی سردار ہے تو اے علم بردارِ قوم
چارہ فرمائی سے تیری ناپدید آخر ہوا
وہ غلامی کا مرض، صدیوں کا وہ آزارِ قوم

تیری تدبیروں نے کاٹی ظلمتِ شب ہائے تار
تیری تنویروں سے اُبھرا مطلعِ انوارِ قوم

تو وطن کی شان و شوکت، تو وطن کی آبرو
ہے ریاضت سے تری گنگ و جمن کی آبرو

اے کہ تیری ہر گرج میں ہیبتِ ضرغام ہے
نام تیرا سن کے دشمن لرزہ بر اندام ہے

تیرے عزمِ آہنیں کے سامنے اے ذی ہمم!
گھاس کے تنکے سے کم تر تیغِ خوں آشام ہے

حق شعاروں کے لئے تو زندگانی کی نوید
ہرزہ کاروں کے لئے تو موت کا پیغام ہے

ٹوٹا پھوٹا وہ پڑا ہے حلقۂ دامِ فرنگ
کارداں دنیا کے کہتے ہیں یہ تیرا کام ہے

حامیِ امن و اماں ہے، پیروِ گاندھی ہے تو
تیرے حق میں حق پسندوں کی دعائے عام ہے

سر پہ اپنی قوم کے سایہ ترا برسوں رہے
کاروانِ ہند کا تو رہنما برسوں رہے!

ریاست یا مُلک؟

حیدرآباد میں پولس ایکشن کے بعد غیر ممالک میں حیدرآباد کا ذکر کرتے ہوئے
میر لائق علی اس کو ریاست کے بجائے ملک کہتے رہے۔ اس پر یہ قطعہ موزوں ہوا

حیدرآباد اک ریاست ہے — اس حقیقت کو جانتا ہے مُلک
جا کے پیرس میں اس ریاست کو — فرقہ داروں نے کہہ دیا ہے مُلک
ہے یہ جغرافیہ نیا کوئی — مُلک کے بیچ آگھسا ہے مُلک
تھی سخن گسترانہ بات اگر — سخت بے حد مبالغہ ہے مُلک
زندہ ہوتے امیر و داغ اگر — جن کی جاگیر شعر کا ہے مُلک
وہ بھی کہتے کہ اس قصیدے میں — ناروا بلکہ ناسزا ہے "مُلک"

کیوں نہ عرشِ بریں کہا اس کو
مجھ کو حیرت ہے کیوں کہا ہے "مُلک"

ایشیا

جنوری سنہ ۱۹۴۹ء میں نئی دہلی میں ایشیائی کانفرنس کے انعقاد کی تقریب میں یہ شعر موزوں ہوئے

ہوگا بلند پھر عَلَمِ شانِ ایشیا
آئے ہیں ٹھان کر یہ محبّانِ ایشیا

بازیچۂ فرنگ رہا ہے جو مدّتوں!
اب صاف ہو رہا ہے وہ میدانِ ایشیا

وہ دن نہیں ہے دُور کہ ہو جائے پاک و صاف
محکومیوں کے داغ سے دامانِ ایشیا

صدیوں کے بعد سوزِ دلِ اہلِ ہند سے
روشن ہوئی ہے شمع شبستانِ ایشیا

پھیلے گی اس سے روشنی عالم میں امن کی
ہوگا ظہورِ مہرِ درخشانِ ایشیا

اب ایشیائیوں کا یہی عزم ہے کہ ہو
ماضی کی بات قصّۂ حرمانِ ایشیا

گوتم، مسیح، اور محمدؐ کے باوجود!
دنیا میں کیوں ذلیل ہو انسانِ ایشیا

سفیرانِ ایشیا

گُل چینیٔ فرنگ سے بے آبرو رہی
ہر فصل میں بہارِ گلستانِ ایشیا
مُدّت کے بعد کھُل ہی گئی باغباں کی آنکھ
چمکی کچھ ایسی صبحِ درخشانِ ایشیا
نہرو نے کی بلند صدا احتجاج کی
دیکھا گیا نہ حالِ پریشانِ ایشیا
دہلی میں سربلند ہوا چاہتا ہے پھر
صدیوں کا سرنگوں عَلَمِ شانِ ایشیا
برکت نئی تمھارے عزائم کو دے خدا!
صد مرحبا! گروہِ سفیرانِ ایشیا

خیر مقدم

اخبار نویسانِ پاکستان کے وفدِ خیرسگالی کی آمد پر

اے صحافت کی زمیں کے آسمانو، مرحبا
منزلِ امن و اماں کے اے نشانو، مرحبا
گلشنِ تہذیب کے اے باغبانو، مرحبا
عالمِ جمہور کے اے ترجمانو، مرحبا

اے معزز میہمانو، مرحبا، صد مرحبا!
نکتہ سنجو، نکتہ دانو، مرحبا، صد مرحبا!

آشتی، آرام کا لے کر پیامِ جاں فزا
آئے ہو ہندوستاں میں از رہِ صدق و صفا

ذرّہ ذرّہ ہے یہاں کا طالبِ مہر و وفا
گامزن ہیں راہِ گاندھی پر ہمارے رہنما

معتقد یعنی اہنسا کے جوان و پیر ہیں
آیۂ "لاتُفْسِدُوْا فِی الْاَرْض" کی تفسیر ہیں

آپ کی سعیٔ مبارک بارور ہو گی ضرور
شاخِ نخلِ خیرخواہی پُرثمر ہو گی ضرور

دونوں ملکوں کو تمیزِ خیر و شر ہوگی ضرور
امن کی منزل پہ دونوں کی نظر ہوگی ضرور

اب کریں پرہیز دونوں کشت و خوں کی یاد سے
کیا ملے گا ہم کو اس دورِ جنوں کی یاد سے

اس حقیقت کا مگر ہے ناگزیر اظہار بھی
تھے جنوں انگیزیوں میں پیش پیش اخبار بھی

شامل اِس گھمسان میں شاعر بھی تھے، نثار بھی،
نثر بھی تیغِ رواں تھی، نظم کے اشعار بھی

اب یہ لازم ہے کہ سب کو راستی منظور ہو
خار زارِ فتنہ و شر سے صحافت دور ہو

فتنہ و شر نے کیا ہے ہم کو دنیا میں ذلیل
اندمالِ زخمِ ذلت کی کوئی سوچیں سبیل

یوں نہ ہوتا، گر نہ ہوتی غیر کی نیت ذلیل
خیر اب تو آپ ہم ہیں اپنی عزت کے کفیل

کیوں نہ لیں اپنی روایاتِ رواداری سے کام
جس سے ہو دنیا میں روشن ہند و پاکستان کا نام

ہماری بُرائیاں

انگریز سے منسوب کیا کرتے تھے اُس کو
آتی تھی نظر ہم کو وطن میں جو بُرائی
کہتے تھے کہ لاچار ہے، مجبور ہے محکوم
محکوم کے نقصان میں ہے حاکم کی بھلائی

دو سال ہوئے دورِ غلامی کو سدھارے
اب حاکم و محکوم کا جھگڑا نہیں باقی
کوئی یہ بتائے کہ ہے وہ کون بُرائی
ویسا ہی وجود آج بھی جس کا نہیں باقی

۱۹۴۹ء

آگ لگانے والے

چین پائیں گے کہاں آگ لگانے والے
خود ہی جل جائیں گے اوروں کو جلانے والے
بھول لیں طاقت پہ نہ شوکت کی زبانے والے
اور بھی زیرِ فلک دور ہیں آنے والے

ستم و جور کی قائم نہ رہیں گی گھاتیں
دن کبھی کے ہیں بُرے اور کبھی کی راتیں

ہے اگر کوئی خدا، اور خدا ہے بھی ضرور
اُس کے انصاف کا ٹوٹے گا نہ ہرگز دستور
جن کے اعمال سے ہے امن کی دنیا میں فتور
ایک دن اپنی رعونت سے وہ ہوں گے مقہور

کسی قانون پہ چلتا ہے نظامِ عالم
زیرِ انصاف بدلتا ہے نظامِ عالم

پیامِ صُلح

لائی پیغام موجِ بادِ بہار ‏ کہ ہوئی ختم شورشِ کشمیر
دل ہوئے شاد امن کیشوں کے ‏ ہے یہ گاندھی کے خواب کی تعبیر
صُلح جوئی ہیں، امن کوشی ہیں ‏ کاش ہوتی نہ اس قدر تاخیر
تاکہ ہوتا نہ اس قدر نقصاں ‏ اور ہوتی نہ دہر میں تشہیر
بچ گئے ہوتے نوجواں کتنے ‏ جن کو مروا دیا بہ صرفِ کثیر
ذکر کیا اس کا، جو ہوا سو ہوا ‏ ان بچاروں کی تھی یہی تقدیر
کام لیں اب ذرا تحمّل سے ‏ دونوں ملکوں کے حسبِ تدبیر
دل سے تخریب کا خیال ہو دُور ‏ اور ہو جائیں مائلِ تعمیر

جنگ اس میں خلوص کا جوہر — کھنچ رہی ہے جو امن کی تصویر
عہد و پیماں ہوں وقفِ استقلال — اُن کی تکمیل میں نہ ہو تقصیر
اہلِ اخبار ہوں وفا آموز — قاطعِ دوستی نہ ہو تحریر
پیشوایانِ ملک و ملت کی — ہو مودت فروز ہر تقریر
عامۃ الناس ہوں اخوت نہاد — کسی عنوان اشتعال پذیر
غیرتِ آشتی بلند رہے — اندرونِ نیام ہو شمشیر
ہر دو جانب کی بستیاں بسیں — ہیں جو محبوس قیدِ بے زنجیر
جب نہ جھگڑے ہوں، ہو جائیں — اُن کا کیا جرم؟ کیوں رہیں وہ اسیر
ہے تقاضا یہ شرافت کا — دونوں ملکوں کی اس میں ہے توقیر
بنیں ہند و پاکستاں — تیری رحمت سے اے خدائے قدیر

ذہن پرواز ہو چکا محروم
ہے یہی گو حفیظ اور تاثیر

آزاد ہندوستان

دہلی میں پہلے جشنِ جمہوریت کی تقریب پر

بلندی پہ ہے آج اپنا ستارا، وہ پستی، جو تھی ننگِ ہستی، کہاں ہے
کہ لطفِ خدائے جہاں آفریں سے، زمینِ وطن رشکِ آسماں ہے
گیا وہ زمانہ کہ محکوم تھے ہم، ستمدیدہ، بدحال، مظلوم تھے ہم
اب آزاد ہیں اور دلشاد ہیں ہم، کہ آزاد و آباد ہندوستاں ہے
یہ مشرق اہنسا کے خورشید کا ہے، یہ مرکز زمانے کی امّید کا ہے
پیامی ہے انصاف و امن و اماں کا، دلِ ایشیا اور فخرِ جہاں ہے
ہمالہ کا سر فخر سے اور بھی آج اونچا ہوا ہے بصد شان و شوکت
نیا اوج گنگا کی ہر موج میں ہے، نئی خوش خرامی سے جمنا رواں ہے
نہ جورِ زمن کی شکایت ہے باقی، نہ دورِ کہن کی حکایت ہے باقی
غلامی ہے اک بھولی بسری کہانی، نئی بزم ہے اور نئی داستاں ہے
نہ گلچیں کے ہاتھوں پریشانِ گلِ تر، نہ صیّاد کی ہے نظر آشیاں پر
غرض عہدِ امن و اماں ہے سراسر، نوا ریز بلبل، چمن گلفشاں ہے
ہر اک فرقہ آسودہ ہے اس وطن میں، گل و سبزہ و خار جیسے چمن میں
ترنگا جو لہرا رہا ہے فلک پر، علم اپنی جمہوریت کا نشاں ہے

۲۶ جنوری

روزِ سعید آیا چھبّیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا!

یہ دورِ نو مبارک فرخندہ اختری کا
جمہوریت کا آغاز، انجام قیصری کا
کیا جانفزا ہے جلوہ خورشیدِ خاوری کا
ہر اک شعارِ رقصاں مصرع ہے انوری کا

جمہوریت نے پرچم لہرا کے سروری کا
توڑا طلسمِ باطل شاہوں کی خودسری کا
دکھلا دیا جہاں کو انجام قیصری کا
جمہور کو مبارک یہ دور داوری کا

اے شاعرو! دکھاؤ جوہر سخنوری کا
اے مطربو! جگاؤ جادو نواگری کا
ہے یہ اثر وطن کی فرخندہ اختری کا
ذرّوں نے اوج پایا تاروں کی ہمسری کا

بھارت کی برتری میں کس کو کلام ہے اب
تھا جو رہینِ پستی گردوں مقام ہے اب
جمہوریت پہ قائم سارا نظام ہے اب
اعلیٰ ہے یا ہے ادنیٰ با احترام ہے اب

صدیوں کے بند ٹوٹے، آزاد ہو گئے ہم
قیدِ گراں سے چھوٹے، دل شاد ہو گئے ہم
بے خوف، بے نیازِ صیّاد ہو گئے ہم
پھر بس گیا نشیمن، آباد ہو گئے ہم

مُضطر جو تھی دلوں میں وہ آرزو بر آئی
تکمیلِ آرزو نے دل کی خلش مٹائی
جس مُلک پر غلامی بن بن کے شام چھائی
صبحِ مسرّت اُس کو اللہ نے دکھائی

تعبیرِ خوابِ گاندھی، تفسیرِ حالِ نہرو
آزاد کی ریاضت، سردار کی تگاپُو
رخشاں ہے حُریّت کا زیبا نگارِ دلجُو
تسکینِ قلبِ مُسلم، آرامِ جانِ ہندو

قرباں ہوئے جو اس پر رُوحیں ہیں شاد اُن کی
ہم جس سے بہرہ ور ہیں وہ ہے مُراد اُن کی
ہے بسکہ سرفروشی شایانِ داد اُن کی
بھارت کی اِس خوشی میں شامل ہے یاد اُن کی

آزاد ہو گیا جب ہندوستاں ہمارا
ہے سُود کے برابر ہر اک زیاں ہمارا
منزل پہ آن پہنچا جب کارواں ہمارا
کیوں ہو غُبارِ منزل خاطر نشاں ہمارا

ایوانِ فرّخی کی تعمیرِ نَو مُبارک
آئینِ زندگی کی تدبیرِ نَو مُبارک
ہر ذرّۂ وطن کو تنویرِ نَو مُبارک
بھارت کے ہر بشر کو توقیرِ نَو مُبارک

ہر صبحِ دورِ نو کی حورِ ابتسام ہوگی
مثلِ سوادِ گیسو ہر ایک شام ہوگی
جمہوریت ہماری جسمِ احتشام ہوگی
ارض و سما کی گردش اب دورِ جام ہوگی

یہ روزِ پُرسعادت نوروزِ ہند کا ہے
سرمایۂ مسرت، جاں بخش، دل فزا ہے
جلوؤں میں اس کے شامل گاندھی کی ہر دُعا ہے
نہرو کے ولولوں نے اس کو شرف دیا ہے

بھارت کا عزم ہے یہ، توفیق اسے خدا دے
دُنیا سے این و آں کی تفریق کو مٹا دے
امن و اماں سے رہنا ہر ملک کو سکھا دے
ہر قوم شکریے میں ہر سال یہ صدا دے
روزِ سعید آیا چھبّیس جنوری کا
دورِ جدید لایا بھارت کی برتری کا!

مولانا ابوالکلام آزاد

تحسین کے مستحق ہیں وہ احرارِ ملکِ ہند
روشن ہوئی ہے جن سے شبِ تارِ ملکِ ہند
بے اسلحہ جو شوکتِ انگریز سے لڑے
مردانہ حادثاتِ بلاخیز سے لڑے
جو بے نیازِ راحت و آرام سے رہے
زندانیِ فرنگ جو برسوں بنے رہے
جن کے جہاد سے وطن آزاد ہو گیا
قلبِ حزینِ اہلِ وطن شاد ہو گیا

نامِ بلندِ حضرتِ آزاد انہی میں ہے
نازاں ہے جس پہ عالمِ ایجاد، انہی میں ہے

آزاد راہِ راست پہ گاندھی کا ہمقدم
نقشِ وقارِ ہند ہے جس کا قدم قدم

آزاد ہے وہ مردِ مجاہد کہ جس کا نام
رخشاں رہے گا ہند کی تاریخ میں مدام

سر منزلِ وفا پہ رواں عمر بھر رہا
جور و ستم کے سامنے سینہ سپر رہا

علم و ادب کا چشمۂ جاری ہے جس کی ذات
ہے دھوم جس کے فضل کی تا دجلہ و فرات

یارب یہ چشمہ ہند میں برسوں رواں رہے
یہ سرپرستِ علم و ادب جاوداں رہے!

۱۹۵۴ء

آہ! سر تیج بہادر سپرو

سر تیج بہادر بھی گئے بزمِ وطن سے
رخصت ہوئی یا نکہتِ گُل صحنِ چمن سے
فریاد ہے اے موت، تری رسمِ کہُن سے
فارغ نہ ہوا ہند کبھی رنج و محن سے
گریاں ہے ادب حُبِّ وطن نالہ کناں ہے
لب پر جو سخن ہے وہ بہ اندازِ فغاں ہے
بے مثل تھا وہ ماہرِ آئینِ سیاست
زیبا اسے پیغمبریِ دینِ سیاست
وہ پیکرِ سنجیدۂ تمکینِ سیاست
استادِ دبستانِ قوانینِ سیاست
ذات اُس کی نمائندۂ تہذیبِ کہن تھی
جو بات تھی سرمایۂ اعزازِ وطن تھی!

آہ سروجنی نیڈو

لالہ و گُل کی کمی ہرگز نہ تھی، پھر کس لیے
فصلِ گُل میں خُوں فشاں ہے دیدۂ خونبارِ ہند

یہ سنا نی ہے کہ آہیں بھرتی آئی ہے صبا
اُٹھ گئی اپنے چمن سے بُلبلِ گلزارِ ہند

فخر جن پر ہند کو تھا، اُٹھتے جاتے ہیں وہی
آسماں ہے آہ! کب سے درپئے آزارِ ہند

شانِ مردانِ وطن تھی ذات اے نیڈو تری
جنگِ آزادی میں تھی تو رہبرِ احرارِ ہند

نازِ نسوانِ وطن تھی نغمہ آرائی تری
تیرے دم سے شکّر افشاں تھا لبِ گفتارِ ہند

گرمیِ سوزِ وطن سے پھونک ڈالے تونے دل
تیرے دل سے ہو کے نکلی آہِ آتشبارِ ہند

نام تیرا لکشمی اور پدمنی کے ساتھ ساتھ
صُبحِ محشر تک رہے گا شاملِ اذکارِ ہند

سروجنی نائیڈو کی موت پر

رُخِ اہلِ ہند سے ہے عیاں اثرِ ملالِ سروجنی
کہ وطن کو حادثۂ عظیم، ہے انتقالِ سروجنی

ہیں سکوتِ مرگ کے سائے میں گل و غنچہ سب کہ چمن میں اب
کوئی عندلیبِ نواطراز نہیں مثالِ سروجنی

وہ سرورِ لطفِ سخن کہاں، وہ نوائے توبہ شکن کہاں
کہ فضائے ہند سے اُڑ گیا نشۂ مقالِ سروجنی

جو گُل اُس میں جلوہ طراز ہیں، وہ امینِ نکہت راز ہیں
ہے خزاں کی زد سے بہت پرے چمنِ کمالِ سروجنی

ہیں سخنور آج اگر حزیں تو ملول اہلِ عمل بھی ہیں
عمل و سخن پہ ہے چھا رہا غمِ ارتحالِ سروجنی

اِظہارِ شُکر

رفیع احمد قدوائی وزیر خوراک کی خدمت میں

یاس کی ظُلمت وطن پر جب کہ تھی چھائی ہوئی
گوشۂ عزلت میں تھی اُمّید گھبرائی ہوئی

گرچہ آزادی بہارِ جاں فزا ہے فی المثل
اِس چمن کی ہر کلی لیکن تھی مرجھائی ہوئی

دشمنِ صبر و سکوں تھی فکرِ قُوتِ لایموت
یعنی ہر دل پر مُسلّط ناشکیبائی ہوئی

قحط بن کر جان لیوا تھی وہ بے درماں بلا
سر سے ٹلتی ہی نہ تھی انگریز کی لائی ہوئی

ایک مخلص دردمندِ قوم کی سعیِ بلیغ
مرنے والی قوم کے حق میں مسیحائی ہوئی

جستجوئے صادق و عزمِ مصمّم کے طفیل
چیز جو کھوئی ہوئی تھی بن گئی پائی ہوئی

مشکلیں سب ہو گئیں آساں خدا کے فضل سے
شاملِ تقدیر جب تدبیرِ قدوائی ہوئی!

یادِ قدوائی

منزل کو ہم رواں تھے بصد شوق اور رفیع
ہمت فزائے قافلۂ رہ نورد تھا
ہر مرحلے کو اُس نے تدبّر سے طے کیا
جُرأت میں بےمثال، ذہانت میں فرد تھا
جو مشکل آئی سامنے، ٹھکرا دیا اُسے
ہر سنگِ راہ ایک ہی ٹھوکر میں گرد تھا
اے آہ! کام اُس کا اُسی نے کیا تمام
اہلِ وطن کے واسطے جو دل میں درد تھا
ہندوستاں میں کون ہے اب اس کا جانشیں
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

لالہ لاجپت رائے کی یاد میں

ہم سا جہاں میں درد کا مارا نہیں کوئی
یعنی ہمارے درد کا چارا نہیں کوئی
ویراں دیارِ دل ہے، دل آرا نہیں کوئی
پُرسانِ حالِ زار ہمارا نہیں کوئی
جب سے وطن چھُٹا ہے سہارا نہیں کوئی
کیا انتقام ہم سے لیا انقلاب نے
خوں ایک ایک رگ سے پیا انقلاب نے
غرقابِ اضطراب کیا انقلاب نے
جس میں ہمیں دھکیل دیا انقلاب نے
اُس بحرِ بیکراں کا کنارا نہیں کوئی

دشمن زمیں ہے اور ہے بدخواہ آسماں
مجبور ہو کے پستے ہیں دونوں کے درمیاں
اب کوئی مرحلہ ہے نہ منزل کا ہے نشاں
لٹ پٹ کے قافلہ ہے شبِ تار میں رواں
رہبر بنائیں جس کو ستارا نہیں کوئی

جانِ حزیں ہے منزلِ غمہائے بے قیاس
آئی ہوا نہ شامِ غریباں کی ہم کو راس
ہمدم ہر ایک راہ میں حرماں ہے یا ہراس
آنکھیں دکھا رہی ہے ہمیں ہر قدم پہ یاس
اُمید کا کہیں سے اشارا نہیں کوئی

وہ گُل کہاں ہیں جن سے تھی روشن چمن کی آگ
بلبل کا دل ہے اور ہے رنج و محن کی آگ
حرص و ہوا بھڑک اُٹھے، جیسے ہو بَن کی آگ
افسردہ ہو گئی غمِ اہلِ وطن کی آگ
رخشاں کسی کے دل میں شرارا نہیں کوئی

آتی ہے باغِ دہر میں آزار کو خزاں
کب چھوڑتی ہے سبزہ و اشجار کو خزاں
یکسر گئی لتاڑ گل و خار کو خزاں
تاراج کر گئی ترے گلزار کو خزاں
اے لاجپت! یہاں چمن آرا نہیں کوئی

اس بیکسی میں آتی ہے رہ رہ کے تیری یاد
پنجاب لے کے جاتی ہے رہ رہ کے تیری یاد
نقشے وہی دکھاتی ہے رہ رہ کے تیری یاد
ہم کو لہو رلاتی ہے رہ رہ کے تیری یاد
موجود تو نہیں تو ہمارا نہیں کوئی

کشمیر سے خطاب

صُورتگرِ ازل نے صبحِ ازل دکھایا
اپنا کمالِ صنعت، کر کے تجھے نمایاں
تجھ سا نظر نہ آیا دنیا میں اور کوئی
گُل پوش، گُل بداماں، سرتا قدم گلستاں
اے انتخابِ عالم، اے افتخارِ دوراں
اے وادیِ گُل افشاں!
وہ نقشِ ناز تُو ہے دنیائے رنگ و بُو میں
بے رنگ جس سے رونقِ حُسنِ فرنگ کی ہے
دنیا کے اہلِ ایماں کہتے ہیں جس کو جنت
شرمندہ ہو کے تجھ سے روپوش ہو گئی ہے
ورنہ کہیں تو ہوتے آثارِ باغِ رضواں
اے وادیِ گُل افشاں!

کس کو نصیب ہے یوں اس زندگی میں جنت
جنت کی زندگی ہے جینا فضا میں تیری
موجِ ہوا یہاں ہے رشکِ دمِ مسیحا
عُرفی نے سچ کہا تھا، آب و ہوا میں تیری
مرغِ کباب آکر ہو جائے مرغِ پرّاں[1]

اے وادیٔ گُل افشاں!
شاہوں کے قصر و ایواں اس کو ترس رہے ہیں
جو فیضِ حُسنِ فطرت ہے تیرے جھونپڑوں میں
تُو ریشمی دوشالے دنیا کو دے رہا ہے
تیرا جمالِ رنگیں رخشاں ہے چیتھڑوں میں
دورِ خزاں بھی تیرا ہے رشکِ صد بہاراں

اے وادیٔ گُل افشاں!
دریا دلی سے اپنی قدرت نے تجھ کو بخشے
یہ چشمہ ہائے سیمیں، یہ آبشار تیرے

---

[1] عرفی کا مشہور شعر ہے ؎
ہر سوختہ جانے کہ بکشمیر در آید ۔۔۔ اگر مرغِ کباب است کہ با بال و پر آید

جانِ بہار تیرے باغات اور جنگل
بھرپور ہیں سیم و زر سے یہ کوہسار تیرے
کیا تجھ کو احتیاجِ ظلِ ہوس پناہاں!
اے وادیٔ گل افشاں!

نذرِ ہوس پناہاں اب ہوں گے تیرے دشمن
عزمِ صمیم ہے یہ تیرے فدائیوں کا
اللہ کے کرم سے دن پھر چکے ہیں تیرے
تجھ کو صلہ ملے گا درد آشنائیوں کا
اس پر تلے ہوئے ہیں ہندو ہیں یا مسلماں
اے وادیٔ گل افشاں!

گزری مصیبتوں پر یہ کہہ کے مطمئن ہو
سرمایۂ سعادت ہے دردمند ہونا
آئے ہیں خاتمے پر ایامِ نامساعد
تقدیر میں تری ہے اب سربلند ہونا
دھو ڈال اپنے دل سے داغِ ملالِ حرماں
اے وادیٔ گل افشاں!

پیکرِ ایثار

جواہر لال نہرو

شبابِ زندگی کو، زندگی کی ہر تمنّا کو
جہانِ لطفِ راحت کو، خیالِ عیشِ دنیا کو
امیری اور اس کے ذوقِ نیرنگِ تماشا کو
دل آرا شاہدانِ رنگ و بو کے حسنِ زیبا کو
وطن پر کر دیا قرباں جواہر لال نہرو نے
کیا کتنا بڑا احساں جواہر لال نہرو نے

ثمر آخر ملا ہندوستاں کو اس ریاضت کا
کہ آخر خاتمہ ہو کر رہا دورِ مصیبت کا
جنازہ ہند سے نکلا تشدّد کی حکومت کا
گئے اہلِ غرض ہر چند بو کر بیج نفرت کا
کیا اس بیج کو بے جاں جواہر لال نہرو نے
کیا کتنا بڑا احساں جواہر لال نہرو نے

ملی فرصت نہ اُس کو اک گھڑی آرام پانے کی
غلامی میں رہی اکثر صعوبت قید خانے کی
ہے آزادی میں دُھن اُجڑے وطن کو پھر بسانے کی
غرض ہر دور میں ہر ذمّہ داری اک زمانے کی
اُٹھائی بارُخِ خنداں جواہر لال نہرو نے
کیا کتنا بُرا احساں جواہر لال نہرو نے!

جواہر لال

گرچہ اے ہم نشیں، وطن اپنا — سیم و زر سے نہیں ہے مالامال
غم نہیں ہے، کہ ہے یہاں موجود — گوہرِ بے بہا جواہر لال

ہم نے مانا کہ ہے ابھی دھندلا — مشرقِ آفتابِ جاہ و جلال
فکر کیا ہے، کہ جلوہ آرا ہے — نیّرِ خاوراں، جواہر لال

اس میں بھی شک نہیں کہ ہیں اب تک — ہم وطن بیشتر اسیرِ ملال
یہ بھی دیکھیں کہ ہے مسرت پاش — پیکرِ حریت، جواہر لال

سست رَو گو ہے کارواں اپنا — ہے پُرانی روش پہ اس کی چال
غم نہیں ہے کہ کارواں سالار — مل گیا ہے ہمیں جواہر لال

عاشقِ آرزوئے امن و اماں — آبرو بخشِ عزم و استقلال
جانِ ایثار و پیروِ گاندھی — دولتِ ہند ہے، جواہر لال

مُبارک اے وطن تجھ کو

جواہر لال نہرو کی امریکہ اور یورپ سے واپسی پر

مُبارک اے وطن تجھ کو کہ نہرو کامگار آیا
وطن میں خیریت سے نازشِ شہر و دیار آیا
عزیزِ این و آں، جانِ وطن، فخرِ جہاں نہرو
خدا کا شکر باصد شوکت و عزّ و وقار آیا
دل و جاں سے زبانوں پر یہی آواز آتی ہے
دلوں کا تاجدار آیا، وطن کا جاں نثار آیا
ہُوئی ہر خطہ میں عزت فزائی بارشِ گُل سے
جہاں پہنچا، صدا اُٹھی کہ پیغامِ بہار آیا
رہا خطرے میں جن سے امنِ عالم، امنِ عالم کا
اُنہی سے، شیر اپنا لے کے عہدِ اُستوار آیا
"بنا دو خُلد اس اُجڑی ہوئی دنیا کو اے لوگو!"
فرشتہ امن کا اقصائے عالم میں پکار آیا
پیامِ امن جا کر مشرق و مغرب میں پہنچایا!
جو تھا ہندوستاں پر قرض گاندھی کا، اُتار آیا

دیپ مالا کے چراغ

چراغ پھر ہوئے روشن جو دیپ مالا کے
فلک پہ رہ گئی بزمِ نجوم شرما کے
ازل کے نور کا جلوہ ہے ان چراغوں میں
چراغِ طور کا جلوہ ہے ان چراغوں میں
جھلک ہے عظمتِ ہندوستاں کی آج ان میں
چمک ہے روشنیٔ جاوداں کی آج ان میں
مرے خیال کا پرتو ہے ان کی طلعت میں
اُمیدِ زندگیٔ نو ہے اِن کی طلعت میں
فضائیں ہند کی ہیں آج پُربہار اِن سے
کہ ہو گئے ہیں در و بام لالہ زار اِن سے
نہ کیوں ہو جشنِ چراغاں کہ رام راج[1] آیا
تھی آرزو ہمیں جس کی، وہ روز آج آیا

---

[1] رام راج سے عدل و انصاف کی حکومت مراد ہے۔ نہ کہ کسی قوم یا فرقہ کی

دیپ مالا

کٹی ہے عمر غلامی میں ہم نوا میری
اگر رہا ہوں میں غمگیں تو کیا خطا میری
مرے کلام میں ہے رنج و غم کا گر اظہار
صدائے قلبِ ستمدیدہ تھے مرے اشعار
وطن میں آئی مسرت کی جب کوئی تقریب
اضافہ کر گئی غم میں مرے وہی تقریب
چراغ گھر میں جلاتا تھا دیپ مالا پر
تو اُن کی لَو سے بھڑکتا تھا اور سوزِ جگر
ہوا نہ دل سے کبھی مائلِ چراغاں میں
کہ یوں سخن میں دکھاتا تھا سوزِ پنہاں میں

نگاہِ دیدۂ ظاہر میں گو چراغ ہیں یہ ؎
چراغ ان کو نہ کہئے جگر کے داغ ہیں یہ

خدا کا شکر ہے، وہ دورِ ابتلا گزرا
ہمارے خون سے گو کھیلتا ہوا گزرا

خدا کا شکر کہ آزاد ہے وطن اپنا
ہوا کبھی تو بہار آشنا چمن اپنا

چراغ گھی کے جلائیں تو ہے بجا اب کے
ظہورِ شامِ دوالی ہے جاں فزا اب کے

چراغ اب کے بصد کرّ و فر جلائیں گے
مکاں نہیں تو سرِ رہ گزر جلائیں گے

؎ یہ شعر دیپ مالا کے عنوان سے لکھی ہوئی ایک پرانی نظم کا ہے۔ محروم

بیساکھی

زمیں کی شکل بدلی اور رنگِ آسماں بدلا
کہ فصلِ نَو کی ہے ہندوستاں میں جلوہ فرمائی
طِلائی ہو گئے میداں زمرّد پوش تھے جتنے
دلِ دہقاں میں امیدِ حیاتِ تازہ لہرائی
دلوں میں اس نے برپا کر دیئے یادوں کے ہنگامے
بیساکھی آج اپنے ساتھ اک طوفان لے آئی
یہی تیوہار تھا، ڈائر نے جس دن جلیانوالے میں
سرِ اہلِ وطن پر گولیوں کی آگ برسائی
یہی دن تھا کہا تھا جب علی الاعلان گاندھی نے
کہ اب مہماں ہے یہ دورِ ستم رانی و خود رائی
جن آنکھوں نے درازی دستِ استعمار کی دیکھی
انہی آنکھوں نے استبداد کی دیکھی ہے پسپائی

گوا کے ستم شعار

گھوڑوں پہ ہیں سوار ہوا کے ستم شعار
قائل نہیں ہیں روزِ جزا کے ستم شعار
کیا سامنے نہ ہوں گے خدا کے ستم شعار؟
ٹھہریں گے مستحق نہ سزا کے ستم شعار؟
دشمن ہیں گرچہ صدق و صفا کے ستم شعار
کب تک ستم کریں گے گوا کے ستم شعار
چھپ چھپ کے جھاڑیوں سے طمنچے چلائیں جو
عورت کو آہ! جامِ شہادت پلائیں جو
گالی بغیر بات زباں پر نہ لائیں جو!
انسانیت کا اپنی جنازہ اُٹھائیں جو
ظالم غضب کے اور بلا کے ستم شعار
کب تک ستم کریں گے گوا کے ستم شعار
کب تک رہیں گے خونِ شہیداں سے سرخرو
سارا جہان اُن پہ کرے گا تفو، تفو

ہندوستان پر یہ حکومت کی آرزو
ہو کر ذلیل کھوئے گی مغرب کی آبرو
جائیں گے عزت اپنی گنوا کے ستم شعار
کب تک ستم کریں گے گوا کے ستم شعار

غاصب کو زیرِ چرخ ملی ہے اماں کبھی؟
کیا رُک گئی ہے گردشِ ہفت آسماں کبھی؟
آئے گا اِن کو راس نہ دورِ زماں کبھی
مٹ جائیں گے یہ دشمنِ امن و اماں کبھی
کب تک رکھیں گے خود کو چھپا کے ستم شعار
کب تک ستم کریں گے گوا کے ستم شعار

برسائی ہیں انھوں نے نہتّوں پہ گولیاں
ڈائر کی طرح خود کو سمجھتے ہیں کامراں
لیتے ہیں اہلِ ہند کی غیرت کا امتحاں
اک آگ بھی ہے بحرِ اہنسا کے درمیاں
سن لیں یہ بات کان لگا کے ستم شعار
کب تک ستم کریں گے گوا کے ستم شعار

صُوبائی حد بندی

تخریب پسندوں کی سرگرمیوں کے پیشِ نظر

کمیشن نے برپا ستم کردیا — بڑھایا یہ صوبہ، وہ کم کردیا
اُکھاڑے درختوں کے مانندِ شہر — انھیں دُور جاکر بسایا، یہ قہر
وہاں اب وہ برباد ہوجائیں گے — مکیں اُن کے ناشاد ہوجائیں گے
اُٹھو اور اُٹھ کر بغاوت کرو — حکومت کو مغلوبِ دہشت کرو
سکیمیں ترقی کی سب ہیں فضول — کریں گے ہم اُن کو نہ ہرگز قبول

ہم اپنے ہی صوبے بسائیں گے خود
وہیں اپنی قبریں بنائیں گے خود

سُرخ مینار

برج روڈ، سبزی منڈی کے قریب ۔ انگریزی فتح دہلی کی یادگار

یادگارِ محشرِ دہلی ہے یہ مینارِ سُرخ
یعنی دہلی پر یہیں سے آگ برسائی گئی
بڑھ گئی بھارت کی میعادِ غلامی سو برس
پھر نئے سر سے اسے زنجیر پہنائی گئی

ثبت اس مینار کے پہلو میں اُن کے نام ہیں
جو ستمگر ڈھالنے والے تھے اس زنجیر کے
آخر اس بھٹی میں خود فی النار ہو کر رہ گئے
بس چلا اُن کا نہ کچھ بھی سامنے تقدیر کے

سر اٹھائے ہے پہاڑی پر کلیسا کی طرح
اور قرباں ہو رہی ہے سر پہ تقدیسِ صلیب
مدعا یہ ہے کہ عیسیٰ کی طرح معصوم تھے
ہند کی آئندہ صد سالہ غلامی کے نقیب

دیوِ استعمار کے کارندگانِ سنگدل
کوئی دیکھے تو ذرا، کیا کر گئے، کیا بھر گئے
قتل و غارت کو سمجھ کر زندگی کا مدعا
چھوڑ کر دہلی میں اپنے نام کے پتھر گئے

دیکھ کر ان یادگاروں کو دلِ اہلِ وطن
شمعِ آزادی کے پروانوں پہ ہے ماتم کناں
وہ محبانِ وطن کرتا رہے گا جن کو پیش
ہدیۂ اشکِ عقیدت دیدۂ ہندوستاں

لکشمی بائی وہ جھانسی کی مہارانی، جسے
شیر کا دل جسم عورت کا مُقدّر نے دیا
اُس شہیدِ حریّت کو، حیف ہے، اے چرخِ دوں
تُو نے بعدِ قتل بخشی خار اور خس کی چِتا

ذکر سے اس کے جگر پھٹتا ہے، کیوں کر ہو بیاں
جنگِ آزادی میں جو گزری بہادر شاہ پر
خوان لے کر آئے ہیں سفّاک اک ڈھانپا ہوا
جب اُسے کھولا تو نکلے آہ! شہزادوں کے سر

تھے ہزاروں جاں فروشانِ وطن، اک وہ نہیں
کارنامے جن کے ہیں تزئینِ تاریخِ وطن
سینۂ دہلی پہ اس مینارِ سنگیں کا قیام
کچھ نہیں ہے اور جُز توہینِ تاریخِ وطن

بھومی دان

خیراتِ زمین

مانا کہ ہے اناج کی خیرات بھی بجا
کپڑے کا دان در خورِ اوقات بھی بجا
دنیا میں سیم و زر کی کرامات بھی بجا
لعل و گہر ہیں قیمتی، یہ بات بھی بجا
پھل پھول ہیں لطیف، یہ سوغات بھی بجا
خیرات کے لیے ہیں فلزات بھی بجا
لیکن زمیں کے دان کی عظمت ہی اور ہے
بخشندۂ زمیں کی سعادت ہی اور ہے

ہر چند خاک ہے تہِ پائے بشر زمیں
لیکن ہے مہر و ماہ سے تابندہ تر زمیں
جانِ بہار، مادرِ گلہائے تر زمیں
آبستنِ جواہرِ لعل و گہر زمیں
اجناس اور کپاس سے ہے بارور زمیں
ہے کون حاملِ زر و سیم و ثمر زمیں
سائل کو بخشتا ہے جو اپنی زمیں کوئی
اس سے بڑا ثواب جہاں میں نہیں کوئی

مبارک انسان

گریں گی خرمنِ امن و اماں پر بجلیاں کب تک
کہ بادل فتنہ و شر کے سرِ عالم کڑکتے ہیں
زمیں ہے لرزہ بر اندام ایٹم بم کی ہیبت سے
زمیں کیا آسماں پر دل ستاروں کے دھڑکتے ہیں
ملایا خاک و خوں میں اُس نے لاکھوں نوجوانوں کو
ابھی تک دیوِ استبداد کے بازو پھڑکتے ہیں
یہی چرچا ہے دنیا میں، یہی سُننے میں آتا ہے
کہ شعلے آتشِ جنگ و جدل کے پھر بھڑکتے ہیں
مبارک ہیں وہ انساں، فخر ہیں وہ نوعِ انساں کے
جو ان شعلوں پہ صلح و امن کا پانی چھڑکتے ہیں

ماتمِ آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقالِ پُرملال پر

گاندھی کے بعد ہند میں مینارِ روشنی
تھی تیری ایک ذات جو طلعت فشاں رہی
جانے سے تیرے آہ! اندھیرا سا چھا گیا
آزاد! اب وہ نُور کی بارش کہاں رہی
ہاتھوں میں تھا ترے عَلَمِ اتحادِ ملک
سائے میں جس کے قوم بہ امن و اماں رہی
توڑا طلسم جس نے فریبِ فرنگ کا
تیری رفاقت اُس کے لئے حرزِ جاں رہی
برسا کیا جو مینہ ترے فضل و کمال کا
شاخِ امیدِ اہلِ وطن گُل فشاں رہی

ہندوستاں کے مشرق و مغرب میں جابجا
وابستہ تجھ سے عظمتِ ہندوستاں رہی

نقشِ دوام بن گئی تحریر دل نشیں
تقریر تیری حاملِ حُسنِ بیاں رہی

خاک اُڑ رہی ہے آج کنگ ایڈورڈ روڈ پر
جو آب و تاب میں صفتِ کہکشاں رہی

ایامِ فصلِ گُل میں تُو ہم سے جُدا ہوا
گویا بہار اب کے ہماری خزاں رہی

آزاد ہو کے بھی نہ ہوئے غم سے ہم رہا
اپنے لئے وہی رَوِشِ آسماں رہی

محروم ابتدا سے ہمارے نصیب میں
نوحہ گری وہی، وہی طرزِ فغاں رہی

قطعۂ تاریخ

چوں رفت ز دہر آں یگانہ — گنجورِ ادب، سیاست اُستاد
حیراں بُدم بہ فکرِ تاریخ — ہاتف ز فلک چنیں ندا داد
گو با سرِ ہائے یازدہ بار — اے وائے اَبُوالکلام آزاد

۱۹۵۸ء = ۱۱ × (۵ + ۱۷۳)

نفیرِ غم

رباعیات

کیا حادثۂ شدید پیش آیا ہے — جس نے اہلِ وطن کو تڑپایا ہے
ہے زلزلۂ عظیم آزاد کی موت — جس سے بھارت تمام تھرایا ہے

گو قلبِ صمیم کا ہے حامل نہرو — بے طور اُمنڈ آئے ہیں اُس کے آنسو
ہمدم، ہمراز، ہم سفر تھا اُس کا — آزاد گیا کہ اس کا دایاں بازو

اُردو کی بڑھائی جس سے تو نے توقیر — کانوں میں ہے گونجتی ابھی وہ تقریر
اے آہ! ابوالکلام یہ خاموشی — اُردو کی سو گئی ہے گویا تقدیر!

قطعات

تقسیمِ وطن

اکتوبر ۱۹۴۷ء بمقام راولپنڈی

کچھ غم نہیں جو نام وطن کا بدل گیا
بدلا کوئی مقام، نہ راہیں بدل گئیں

صدیوں سے تھے جو ہمدم و ہمسایہ، ہم وطن
غم ہے تو یہ کہ اُن کی نگاہیں بدل گئیں!

ایضاً

کس درجہ ہو گئی ہے کٹھن منزلِ حیات
مشکل سے قطعِ راہ کئے جا رہا ہوں میں

خنجر چھپا ہوا نہ کسی آستیں میں ہو
ہر شخص پر نگاہ کئے جا رہا ہوں میں!

تعمیرِ ہند

سعئ پیہم سے تری منزل پہ پہنچا کارواں
کانگرس! تیرا عَلَم ہے باعثِ توقیرِ ہند
تجھ سے وابستہ ہیں مستقبل کی اُمیدیں تمام
تیری مرہونِ عمل ماضی میں تھی تعمیرِ ہند

لارڈ مونٹ بیٹن کے دہلی سے جانے پر

سایہ فگن جو راہ نشینوں کے سر پہ تھے
طوفانِ ابر و باد میں وہ ٹاٹ بھی گئے
گھر گھاٹ، ٹاٹ کھاٹ کا محروم ذکر کیا
اس انقلاب میں تو بڑے لاٹ بھی گئے

وطن اور پاسدارِ وطن

جو داغ کھائے تھے دل پر وطن پرستوں نے
اسی سے ہو گئی ظاہر نئی بہارِ وطن
انہی کے فیض سے، اے دوست خوں ہوئے جو دل
بہارِ تازہ دکھاتا ہے لالہ زارِ وطن
بہار اُن کو مبارک ہو سرو رجیاں کی!
جو پاسدارِ وطن ہیں، جو ہیں نثارِ وطن

انقلاب

چشمِ مہر و ماہ نے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا
دورِ گردوں نے دکھایا ہے جو ہم کو انقلاب
جاں فزا جن کیلئے تھی جوششِ دریائے سندھ
ریگ زارِ راجپوتانہ میں ہیں وقفِ عذاب
ساحلِ جمنا کے نظّاروں سے جن کو عشق تھا
سندھ کے صحراؤں میں ہیں وہ رہینِ اضطراب
مُہرِ خاموشی ہے اُن کے لب پہ چلّاتے تھے جو
انقلاب، اے انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

تقدیرِ ہند

ہاتھ میں مشعل اہنسا کی اُٹھا کر جائیں گے
مشرق و مغرب میں پھیلائیں گے ہم تنویرِ ہند
کوئی دن میں پھر چمکتا ہے ستارہ ہند کا
اے جہانِ تیرہ اب روشن ہوئی تقدیرِ ہند

نیا سال اور بارانِ رحمت

جہاں خاک اُڑتی تھی ہوگی وہاں سبزہ و گل کی اب جلوہ کاری نمایاں
نیا سال آتے ہی ساتھ اپنے لایا ہے بارانِ رحمت مبارک، مبارک
نئے سال کو دی سلامی جو توپوں سے ہندوستاں نے تو اوجِ فلک سے
گھٹا کی زباں میں گرج کر کہا سالِ نو نے یہ ساعت مبارک مبارک

پہلی بہار

غالب فضائے گُل پہ ابھی خارزار ہے
اُجڑے ہوئے چمن کی یہ پہلی بہار ہے
دلخواہ فصلِ گُل بھی کبھی آ ہی جائے گی
مائل کرم پہ رحمتِ پروردگار ہے

مشورہ

یہ بھی مثلِ جاہلانِ خطۂ پنجاب کیوں
اپنے ہاتھوں اپنے گھر کو وقفِ ویرانی کریں
دلّی والوں سے ہماری تو یہی ہے التجا
مشورہ آصف[1] کا مانیں اور سلیمانی[2] کریں

---

[1] آصف علی مرحوم۔ سلیمان بادشاہ کے وزیر کا نام بھی آصف تھا
[2] یعنی بادشاہی کریں۔ مزے میں رہیں۔

مقامِ غور

(مہاتما گاندھی کے مَرَن برت پر)

اہلِ وطن! خدا کے لئے غور تو کرو
کیا کر رہے ہو دَورِ غلامی گزار کے
منزل پہ لے کے آیا ہے جو رہنما تمھیں
دم لوگے کیا تم اب اُسی محسن کو مار کے؟

تنبیہ

مہاتما گاندھی کے آخری برت پر

دُنیا نے تسلیم کیا ہے سب سے بڑا انسان جسے
اپنے جینے سے پیاری ہے نوعِ بشر کی آن جسے
فیضِ ریاضت سے حاصل ہے ہستی کا عرفان جسے
جس کے عمل کا آئینہ ہے، کہتے ہیں ایمان جسے
ہاتھ سے اپنے اُس کو گنوا کر آخر ہم کیا پائیں گے
ہاتھ ملیں گے، روئیں گے، شرمائیں گے پچھتائیں گے

مرن برت

اتحادِ ہندو مسلم کی خاطر آج پھر
جان کی بازی لگا دی تو نے اے جانِ وطن
دل دھڑکتے ہیں، پریشاں تر نہ ہو جائے کہیں
تیرے اس ایثار سے حالِ پریشانِ وطن

قتلِ گاندھی

آہ! کیا ہولناک شام ہے یہ — شورِ محشر بپا ہے دہلی میں
عمر بھر جو نثارِ ہند رہا — قتل وہ ہو گیا ہے دہلی میں

مہاتما جی کی شہادت پر

بہ وقتِ دُعا جانِ بزمِ وطن پر
وہ انساں نہیں جس نے حملہ کیا ہے
تشدّد کا تھا اب کہ بدخواہ گاندھی
تشدّد نے خود آکے بدلہ لیا ہے

ایضاً

جان دے دی فرقہ داری کو مٹانے کے لئے
کاش پوری آرزوئے دل ہو یہ مر کر تری
اتحادِ ملک کا حامی رہا تو عمر بھر
کیوں نہ سنگم میں بہائی جائے خاکستر تری

مہاتما جی کے پھول

شمیمِ اُنس، خوشبوئے وفا ہے تیرے پھولوں میں
ترے دل کی طرح صدق و صفا ہے تیرے پھولوں میں
ہوائے قدس، جنت کی فضا ہے تیرے پھولوں میں
بہارِ جاوداں، رنگِ بقا ہے تیرے پھولوں میں
بسے گا عالمِ فانی ترے پھولوں کی خوشبو سے
کہ شادابی ملی ہے ان کو اشکِ چشمِ نہرو سے

مہاتما گاندھی

عالم تمام اُداس ہوا، تُو جو ہو گیا
اے امن و آشتی کے پیمبر، خموش آج
ہل چل سی ایک مشرق و مغرب میں ہے بپا
اقوام چُپکے چُپکے ہیں پیکار کوش آج

مہاتما گاندھی کا مُعجزہ

اس میں کیا شک ہے کہ گاندھی تھا فقیرِ کامل
تھا وہ کلجگ میں بھی احکامِ خُدا کا عامِل
دیکھ لیں، کشف و کرامات کے ہیں جو قائل
ہند سے رخصتِ "انگریز" ہے سب کا حاصل
چل دیا ہند سے انگریز لڑائی کے بغیر
کیا یہ آسان تھا اعجاز نمائی کے بغیر

۲۶ جنوری

اِسی دن وہ صدا گونجی تھی راوی کے کنارے پر
دلِ دارائیِ انگریز کو دہلا دیا جس نے
یہی یومِ مبارک تھا شبِ تارِ غلامی میں
طلوعِ صبحِ آزادی کا مژدہ لا دیا جس نے
یہی چھبیسویں تاریخ ماہِ جنوری کی تھی
نشاں آزادیٔ کامل کی منزل کا دیا جس نے

سردار پٹیل کا عزمِ پنجاب

سردار نے پنجاب کا جس وقت کیا عزم
"جاتے ہیں کدھر؟" آپ سے اک شخص نے پوچھا
فرمایا کہ "جانا ہے مجھے جانبِ پنجاب
جلسہ ہے وہاں کانگرسی کارکنوں کا"
یوں اُس نے کہا "کون ہیں وہ کارکن آخر
ہے آپ کے دیدار کی اب جن کو تمنّا
یہ ابتری ہرگز نہ دکھاتی اُسے تقدیر
پنجاب میں گر کارکن انساں کوئی ہوتا"

پھر زندگی ملی

(سردار پٹیل کے ہوائی جہاز کا حادثہ)

بے پُورسے خبر جو نہ آئی پٹیل کی
دہلی کا دل دھڑکنے لگا اضطراب سے
دم اس طرح فضاؤں کا گھُٹ گھُٹ کے رہ گیا
طاری ہو جیسے خوف کسی انقلاب سے
سر جھک گئے بہ شکر، کہ پھر زندگی ملی
سردارِ ذی حشم کو خدا کی جناب سے

سال گرہ مُبارک

(پنڈت جواہر لال نہرو کے جنم دن پر)

جنم دن تجھ کو مبارک اے جواہر لال ہو
حاملِ یُمن و سعادت، باعثِ اقبال ہو
مُلک و ملّت کے لئے یہ روز فرّخ فال ہو
تو بلند اقبال ہو، دشمن ترا پامال ہو
خوش بزی، تا دیر باش، اے جانِ جاناں شاد باش
شاد باش، اے یوسفِ کنعانِ جاناں شاد باش!

جواہر لال نہرو

نازاں نہیں ہے تجھ پہ فقط آبروئے ہند
قائم ہے تجھ سے جرأتِ احرارِ ایشیا
چشمِ امید کا ہے اشارہ کہ تُو ہے آج
نورِ نگاہِ دیدۂ بیدارِ ایشیا

کشمیر میں طرفین کا ملاپ

وقت آ ہی گیا رخصتِ ایامِ خزاں کا
گل پوش ہوئی جاتی ہے پھر وادیِ کشمیر
اک دوسرے پہ کرتے تھے گولوں کی جو بارش
آپس میں بصد شوق ملے ہو کے بغل گیر

انصاف

جواہر لال نہرو کے ایک اعلان پر

ہر اک ملّت کو ملّت سے، ہر اک کشور کو کشور سے
ہر اک انسان کو انسان سے انصاف لازم ہے
میں حیراں ہوں خموشی چھا گئی کیوں اہلِ محفل پر
کہا نہرو نے جب جاپان سے انصاف لازم ہے

لالہ لاجپت رائے کی برسی پر

کالا خود اپنا نامۂ اعمال کر لیا
دے دے کے جرمِ حبِّ وطن کی سزا تجھے
آخر وطن سے تیرے نکالی گئی وہ قوم
دو بار جس نے دیس نکالا دیا تجھے

بھگوان تلک کی یاد میں

اے رہبرِ ذی شان ترے اہلِ وطن آج
گلہائے عقیدت ترے قدموں پہ چڑھاتے
صیّاد ہے اب اپنے چمن میں نہ ہے گلچیں
مرغانِ چمن پھرتے ہیں آزادی سے گاتے
ہر شخص ہے دل شاد کہ آزاد ہے بھارت
ہم گیت ترے شکریہ کے تجھ کو سناتے
افسوس کہ تو وقت سے پہلے ہوا راہی
بھگوان تلک ہم تری برسی ہیں مناتے!

لالہ لاجپت رائے کی یاد میں

ہمیں جس حال میں رکھے مقدّر جس طرح چاہے
زمیں فتنے اُٹھائے، آسماں نیرنگ دکھلائے
نہ بھولے ہیں، نہ بھولیں گے کبھی ہم روزِ محشر تک
محبانِ وطن کو، رزمِ قومی میں جو کام آئے
شہیدانِ وفا پرور مقیم خلوتِ دل میں
مقامِ برتریں پر ہے انہی میں لاجپت رائے!

ایضاً

موہوم تھی آزادیِ ابنائے وطن جب
جب قوم تھی پابستۂ زنجیرِ غلامی
اے لاجپت! اے فخرِ وطن، نازشِ ملت
تھی آبروئے قوم تری ذاتِ گرامی

گوا کی پولٹیکل کانفرنس کا فیصلہ

ڈیرہ اُٹھاؤ ہند سے اے پرتگالیو
گنجائش اب نہیں ہے کسی قیل وقال کی
ہالینڈ کو گیا کوئی انگلینڈ کو گیا
اب راہ تم بھی خیر سے لو پرتگال کی!

ہندوستان اور جنوبی افریقہ

جب اک جماعتِ عزّت نشاں کے ممبر ہیں
نٹال میں نہ ملے کیوں برابری ہم کو
زباں پہ حرفِ وفا اور آستیں میں چھری
کبھی نہ بھائے گی ایسی برادری ہم کو

امتیازِ رنگ

چہرہ جو ہے سفید تو کیا، دل سیاہ ہے
بیہودگی سے کم نہیں گورے کا نازِ رنگ
قائم نہ رہ سکے گی حکومت ملان کی!
اک روز رنگ لائے گا یہ امتیازِ رنگ

ہند اور ایران کا معاہدۂ دوستی

تضمین

سُنا ہے کہ ایران او رہند میں ... ہے تجویز اُلفت کے پیمان کی
یقیناً یہ ہے مژدۂ جانفزا ... نہیں جھوٹ کہتے ہیں ایمان کی
اسی پر ہمارا بھی ہے اعتقاد ... یہ تعلیم ہے شیخِ ایران کی
"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند"

فرقہ واری

ہند میں جس کو نہیں منظور جمہوری نظام
ہند سے کیا اُس کو مطلب ہند سے کیا اُس کو کام
خواہ ہندو، خواہ مُسلم ہو تعصّب کا غلام
ڈھونڈ لے وہ ہند سے باہر کہیں جا کر مقام
فرقہ واری سے ہے بالاتر ہماری سرزمیں
تنگ ہوگی فرقہ واروں پر ہماری سرزمیں

جشنِ جمہوریت اور فرقہ وار لیڈر

نظر آتی ہے فرقہ واری میں ایک لیڈر کو اپنی سرداری
اہلِ بینش پہ ہے مگر روشن فرقہ واری کا زہر ہے کاری
فرقہ واری سے جو ملا ہم کو آج تک اُس پہ اشک ہیں جاری
دشمنی مادرِ وطن سے ہے
جشنِ جمہوریت سے بیزاری

فرقہ پرستی

اب ہم پہ کرم چاہیئے اے فرقہ پرستی
کر بیٹھے ہیں تیرے لئے لاکھوں کا صفایا
جا، اور کہیں جا، تری خاطر، ترے ہاتھوں
گاندھی سا رتن، ہاتھ سے خود ہم نے گنوایا

ہڑتال

عہدِ انگریز میں ہڑتال کا مقصد یہ تھا
کہ ہو برہم کسی حیلے سے حکومت کا نظام
اب کہ اپنا ہے نظام اور حکومت اپنی
کس لئے اہلِ وطن لیتے ہیں ہڑتال سے کام
وقتِ تعمیر ہے تخریب کا وہ دَور گیا
اب تو ہڑتال کے بدلے ہو تعاون کا پیام

قطعہ

بعض رُوپ دھاری محبانِ وطن کی خود غرضی کو دیکھ کر

فکرِ تعمیرِ نشیمن ہو کسے اے ہمنوا
جب نہ ہو شاخِ چمن سے گُلفشانی کی اُمید
وائے قسمت، ہو گئے صیاد اور گلچیں وہی
جن سے تھی اہلِ چمن کو باغبانی کی اُمید

ابُوالکلام آزاد

بادِ سمُوم جس پہ اثر کچھ نہ کر سکی
اُس نخلِ پُر بہار کے سائے میں کیوں نہ آئیں
اسلامیانِ ہند کو کہتے ہیں جو غلام
وہ اپنی مملکت میں اک آزاد تو دکھائیں

مشرق کی بیداری

ہوئی باطل شکن لمحات میں مشرق کی بیداری
چلے گی ساحرِ افرنگ کی اب کیا فسوں کاری

شبِ غفلت گئی، جب خواب تھی آزادیِ مشرق
ہے اب خوابِ کہن مشرق پہ مغرب کی عملداری

پیامِ امن پھر روحانیت کی سرزمیں دے گی
رہے گی اب نہ زیرِ آسماں رسمِ ستمگاری

جو پہنچائے گی پیغامِ وفا اقصائے عالم میں
کرے گا اِس مہم کی ایشیا دہلی میں تیاری